

## جاسوسی دنیا نمبر 69

ٹھنڈی آگ

(مکمل ناول)

اس کتاب کا پیش رس کسی کے اس مقولے سے شروع کر رہا ہوں کہ  
”دیر آید درست آید“

فی الحال جو کچھ بھی ہے حاضر ہے۔

میں ان تمام دوستوں کا بھید مشکور ہوں جنہوں نے لاہور کے ایک  
پبلشر کی اس غیر قانونی حرکت کے سلسلے میں مجھے خطوط لکھے ہیں کہ اس نے  
میرا ناول ”طوفان کا انغواء“ بعض ناموں کی تبدیلی کے ساتھ پیش کر کے  
شرافت کا نیاریکارڈ قائم کیا ہے۔ آپ یقین کیجئے کہ اس نے یہ اقدام میری  
اجازت حاصل کئے بغیر کیا تھا اور اس سلسلے میں ان تمام لوگوں کے خلاف  
قانونی کارروائی کی جا رہی ہے۔ جنہوں نے غیر قانونی طور پر اس کتاب کی  
طباعت اشاعت اور فروخت میں حصہ لیا ہے۔

خیر چھوڑیئے یہ سب تو ہوتا ہی رہتا ہے.... اس بار آپ کیپٹن حمید  
سے براہ راست گفتگو کر سکیں گے۔ کیوں کہ وہ خود ہی براہ راست آپ کو  
مخاطب کر رہا ہے۔ اپنے مخصوص انداز میں اس نے کیسی پھل جھڑیاں  
چھوڑی ہیں۔ اس کا اندازہ تو آپ کہانی پڑھ کر ہی لگا سکیں گے۔ کہانی بھی  
حیرت زدہ کر دینے والی ہے۔ اس کہانی سے آپ کو یہ بھی معلوم ہو سکے گا کہ  
کرنل فریدی اور کیپٹن حمید کس طرح یکجا ہوئے تھے۔ یہ واقعہ دلچسپ بھی  
ہے اور بڑی حد تک درد انگیز بھی۔ مگر حمید ہی اس ٹریجڈی کا پس منظر بھی  
آپ پر واضح کر دے گا۔

ابن صفہ

۶ اکتوبر ۱۹۵۷ء

## میز پر لاش

یقین کیجئے یا نہ کیجئے کہ آج میں.... یعنی کیپٹن حمید آپ سے براہ راست مخاطب ہوں....  
براہ راست مخاطب کرنے کی یوں ضرورت پیش آئی کہ تذکرہ نویسوں نے (میں ان کی نیت پر شبہ  
نہیں کرتا) یا تو میرے ساتھ پورا پورا انصاف نہیں کیا یا پھر آپ ہی نے ان کی تحریروں سے غلط  
مطالب اخذ کئے ہوں۔ ویسے میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ اکثر میری تقریحات کے تذکرے  
مبالغہ آمیز ہو جاتے ہیں۔ مگر آپ یہ تو سوچئے کہ ذہب داستان کے لئے بھی تو کچھ نہ کچھ ہوتا ہی  
چاہئے۔ لہذا مجھے اپنے تذکرہ نویس صاحب سے اس سلسلے میں کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں تو  
دراصل یہ چاہتا ہوں کہ آپ میرے متعلق کوئی غلط رائے نہ قائم کریں۔ ویسے اگر آپ نے کر بھی  
لی تو میرا کیا بگاڑ لیں گے.... جی ہاں۔

خفا ہونے کی ضرورت نہیں۔ بات دراصل یہ ہے کہ تمہید کے طور پر بھی تو کچھ ہوتا  
چاہئے۔ اب پوں ہی گفتگو کیسے شروع کر دی جائے۔ پھر کیا میں یہ لکھتا کہ اپنی یہ کہانی میں خود ہی  
بیان کروں گا۔ جو کچھ کرتا ہے کر لیجئے؟ کیا میں آپ سے کمزور ہوں۔ آپ خود سوچئے اپنی کہانی اپنی  
زبانی سے بیان کرنے میں کتنا لطف آتا ہے اور کون نہیں چاہتا کہ دس آدمیوں میں بیٹھ کر اپنی  
کہانیاں بیان کرے.... جس کے پاس اپنی کہانیاں نہیں ہوتیں وہ گھڑتا ہے ایسی کہانیاں جو کسی  
معاملے میں دوسروں کو مرعوب کر سکیں۔ مثلاً اگر آپ جوان ہیں تو اپنے عشق کی ایسی داستانیں  
سنائیں گے کہ سننے والے اپنا دن کا چین اور راتوں کی نیند حرام کر بیٹھیں۔ اگر آپ بوڑھے ہیں تو  
اپنے ایام تحصیلداری کے ایسے قصے سنائیں گے کہ جیسے آپ سے بڑا تحصیلدار آج تک پیدا ہی نہ

ہوا ہو۔ اگر آپ بچے ہیں تو اپنی بہادری کی ڈینگیں اس طرح مارتے پھریں گے جیسے آپ وہی ہیں جسے سیرخ اپنے گھونسلے میں اٹھالے گیا تھا اور بعد کو آپ رستم کے پردادا کہلائے تھے۔

بہر حال بات صرف اتنی سی ہے کہ میں اپنی کہانی خود ہی بیان کرنا چاہتا ہوں۔ بہتر سے حضرات یہ جاننا چاہتے ہیں کہ میں اور کرنل کب اور کن حالات میں یکجا ہوئے تھے۔ چلے پہلے یہی سن لیجئے۔ میں نے بی۔ اے کیا تھا اور ایم اے میں پڑھ رہا تھا کہ تیسری جنگ شروع ہو گئی۔ میرے باپ ایک بہت بڑے زمیندار اور تاج برطانیہ کے وفادار ترین لوگوں میں سے تھے انہوں نے گاؤں سے رگروٹ بھرتی کرانے شروع کئے۔ وہ فخریہ لوگوں سے کہتے کہ وہ حکومت کے اتنے وفادار ہیں کہ اس کی مدد کے لئے سب کچھ کر سکتے ہیں۔ ایک بار کسی ہم چشم نے کہہ دیا کہ خان صاحب تمہارا بھی تو جوان بیٹا ہے اسے فوج میں بھرتی کراؤ۔ تب ہم دیکھیں گے کہ کتنے وفادار ہو۔ چنانچہ آگیا جلال خان صاحب کو اور مجھے اسی دن حکم دیا کہ میں کمیشن لے لوں۔ میں نے قسمیں کھائیں کہ میں قطعی اس قابل نہیں ہوں۔ یقین نہ آئے تو استاد تشنہ مراو آبادی سے پوچھ لیجئے کہ میں نے حال میں شاعری شروع کی ہے اور استاد بین خاں سے ستارہ بھانا بھی سیکھ رہا ہوں مگر کون سنتا ہے فغان درویش۔

کمیشن لینا پڑا۔ جب تک کسی محاذ جنگ پر نہیں جانا پڑا دل کھول کر عیش کئے۔ یقین کیجئے کہ کئی سال ادھر ادھر کیپوں میں بسر ہوتی رہی، اور میں دعائیں مانگتا رہا کہ کسی طرح لڑائی ختم ہو جائے اور میں میدان جنگ کی صورت دیکھے بغیر ہی غازی ساجد حمید بن جاؤں۔ مگر توبہ کیجئے۔ ایک دن کھلونے بنانے والا جاپان بھی جنگ میں کود پڑا اور مشرق بعید میں بھی محاذ جنگ قائم ہو گیا۔

بہر حال مجھے تو اسی وقت یقین ہوا کہ کھلونے بنانے والا جاپان بھی جنگ میں کود سکتا ہے جبکہ میرے یونٹ کو مشرق کے کسی نامعلوم مقام کی طرف روانہ کیا جانے لگا۔

گھروں میں بیٹھ کر جنگ کی خبریں سننا اور پڑھنا اور بات ہے لیکن آپ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ میدان جنگ کس چڑیا کا نام ہے۔ آپ کسی کی فتح اور شکست پر بغلیں تو بجا سکتے ہیں لیکن شکست کھانے والے تو الگ رہے خود فاتحین سے پوچھئے کہ ان پر کیا گزری ہے۔ کیا ان کے ہاتھ اس قابل رہ گئے ہیں کہ وہ بغلیں ہی بجانے کے کام آسکیں۔

آپ یہ نہ سمجھئے گا کہ اب میں میدان جنگ کا نقشہ کھینچ کر آپ کو بور کروں گا میں تو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں ایسا کیوں ہوں۔ میں ہر وقت قہقہے لگانا کیوں چاہتا ہوں۔ مجھے ہر وقت تفریح کی تلاش کیوں رہتی ہے۔ میں اکثر سنجیدگی کے مواقع پر بھی غیر سنجیدہ کیوں نظر آتا ہوں؟ ادھر دیکھئے ذرا میری پچھلی زندگی میں جھانکنے کی کوشش کیجئے۔

میں جس نے شاعری شروع کی تھی۔ میں جو آرٹسٹ خیالات رکھتا تھا۔ میں جس نے ستارہ سیکھنا شروع کیا تھا۔ زبردستی جنگ کے میدان میں دھکیل دیا گیا۔ میں نے طالب علمی کی زندگی میں کبھی بھولے سے بھی یہ نہیں سوچا تھا کہ فوجی بنوں گا۔ (یہ اور بات ہے کہ فلمی ہیرو بننے کے خواب میں نے بکثرت دیکھے ہوں) ہاں تو بالکل غیر متوقع طور پر اور دل پر جبر کر کے میں نے یہ لائن اختیار کی تھی۔ اگر نہ کرتا تو میرے والد خان اپنی دھمکی کے مطابق نہ زندگی بھر میری شکل دیکھتے اور نہ میری شادی پچھن پور کے جاگیردار کی لڑکی سے ہو سکتی جو مجھے بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ میری شکل دیکھتے یا نہ دیکھتے اور میں کسی دوسرے جاگیردار کی لڑکی سے شادی بھی کر سکتا تھا کیونکہ ہر لڑکی لڑکی ہی ہوتی ہے لڑکا نہیں۔ رہا اچھی لگنے کا سوال تو کچھ دنوں کے بعد ہر لڑکی اچھی لگنے لگتی ہے خواہ وہ کوئٹہ کا پتہ ہی کیوں نہ ہو۔ میں دراصل صرف ایک بات سے ڈرتا تھا۔ وہ صرف اتنی سی تھی کہ اگر جیب خرچ بند ہو گیا تو میں کیا کروں گا۔ والد خان کچھ ایسے ہی آدمی تھے جو کہتے کر گزرتے تھے بلکہ پہلے کر گزرتے تھے پھر کہتے تھے۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ کشت و خون قتل و غارت گری نے میری زندگی میں مایوسیاں بھر دیں۔ میں بے تحاشہ شراب پینے لگا تھا اور عورتیں میری زندگی کا جزو لازم بن کر رہ گئی تھیں۔ آپ یقین کیجئے میں اتنا بدنام ہو گیا تھا کہ سزا کے طور پر میرا درجہ گھٹا دیا گیا۔ یعنی سینڈ لیفٹیننٹ سے سارجنٹ بنا دیا گیا۔ لیکن مجھے اس کی بھی پرواہ نہیں تھی۔ کیونکہ میری انگلی سے مضرب نکال کر اسے زبردستی رات نکل کے ٹریگر پر رکھ دیا گیا تھا۔ اسی دوران میں سنگا پور میں تین لڑکیاں آنکرائیں۔ اتفاق سے وہ جاپانی جاسوس تھیں۔ ان کا راز اتفاقاً مجھے معلوم ہوا۔ اس میں میری کوششوں کو دخل نہیں تھا۔ اس کے بعد ہی مجھے ملٹری کی سیکرٹ سروس میں لے لیا گیا۔ مگر عہدہ وہی رہا سارجنٹ کا۔ ان لڑکیوں کے ذریعہ ایک بہت بڑے گروہ کی گرفتاری عمل میں آئی جو منظم طور پر جاپان کے لئے کام کر رہا تھا۔ پھر کچھ ہی دنوں کے بعد جنگ ختم ہو گئی اور مجھ جیسے ہزاروں

تیس مار خاں غازی کہلائے۔

لیکن یقین کیجئے کہ میں پھر گھر واپس نہیں گیا۔ سبکا پور سے واپسی پر میرے ایک شناسا نے جو میرے ہی گاؤں سے تعلق رکھتا تھا اپنی اور میری واپسی کی اطلاع اپنے گھر والوں کو دی تھی۔ والد خان جن سے عرصہ سے خط و کتابت بند تھی اس اطلاع پر مجھے ریسو کرنے دوڑے چلے آئے، مگر میں نے انہیں نہیں پہچانا۔ پہچانے سے انکار ہی کر دیا۔ ان کی آنکھیں حیرت سے پھٹی ہوئی تھیں۔ میں نے کہا کہ میں نے انہیں اس سے پہلے کبھی دیکھا ہی نہیں اگر انہوں نے خواہ مخواہ میرا باپ بننے کی کوشش کی تو میں ان کے خلاف ازالہ حیثیت عربی کا دعویٰ دائر کر دوں گا۔ والد خان اس پر بغلیں جھانکنے لگے۔ یقیناً یہ خبر ان کے لئے ایٹم بم سے کم کسی طرح نہ رہی ہوگی۔ آپ مجھے برا کہیں گے۔ لیکن میری بھی سنئے۔۔۔ والد خان کو کیا حق حاصل تھا کہ مجھے اپنی آن پر بیہش چڑھا دیں۔ مجھ میں اس وقت اتنی کمزوری تھی کہ میں صرف والد خان ہی کو ان داتا تصور کرتا تھا۔ یہ سوچتا تھا کہ اگر انہوں نے اپنی پٹھانی آن کے مقابلے میں میری نافرمانی کو کمتر سمجھا تو مجھے درد کی ٹھوکریں کھانا پڑیں گی اور ہو سکتا ہے کہ میں ایک بہت بڑی جائیداد سے بھی محروم ہو جاؤں۔ مگر اب تو میری دنیا ہی بدل چکی تھی۔ میں ایک ہولناک جنگ دیکھ چکا تھا۔ میں دیکھ چکا تھا کہ آدمی کتنا بے وقعت جانور ہے۔ وہ گرتی ہوئی عمارتوں کے نیچے دب کر کس طرح چیختا اور کراہتا ہے۔ وہ کس طرح چوہے دان میں پھنسے ہوئے چوہوں کی مانند بے بسی سے مر جاتا ہے۔ میں نے کیا نہیں دیکھا تھا۔ سب کچھ دیکھا تھا۔۔۔ اور جو کچھ بھی دیکھا تھا اسی کی پرچھائیں میرا مستقبل بننے والی تھیں اور مستقبل میری نظروں میں کیا تھا۔ اک بیکراں تاریکی۔۔۔ اک ابدی سناٹا۔ جس کے تصور ہی سے ذہن شل ہو کر رہ جائیں۔ خیر ختم کیجئے اس خشک سی کواں سے میں آپ کو بور نہیں کرنا چاہتا۔

ہاں تو جب والد خان میرے باپ ہونے پر مصر تھے اور میں اس کی تردید کر رہا تھا۔ میری نظر ایک آدمی پر پڑی جو بہت دلچسپی سے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ یہ ایک وجیہہ اور نیم شیم نوجوان تھا۔ شخصیت ایسی پرکشش تھی کہ دوسری بار دیکھنے کو بھی دل چاہتا تھا۔ اس کی آنکھیں عجیب تھیں بڑی بڑی پلکیں اور اس طرح نیچے جھکی آرہی تھیں جیسے وہ اسی جگہ کھڑے کھڑے سو جائے گا۔ جیسے ہی ہماری آنکھیں چار ہوئیں اس کے ہونٹوں پر خفیف سی مسکراہٹ نظر آئی اور

وہ مسکراہٹ بھی ایسی ہی تھی جیسے وہ مجھ سے واقف رہا ہو۔

مجھے شرارت سوچھی۔۔۔ والد خان سے بھی پیچھا چھڑانا چاہتا تھا جو جان کو آگئے تھے۔۔۔ بس یوں ہی خواہ مخواہ میں ”بھائی جان“ کہہ کر اس آدمی کی طرف لپکا۔

لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے ”جیتے رہو۔۔۔ خوش رہو۔“ کہہ کر مجھے بھیج لیا اور پھر میری پیٹھ ٹھونک کر بولا۔ ”ارے سنے تو تواب ایک دم جوان ہو گیا ہے۔“

والد خان قریب ہی کھڑے آنکھیں مل مل کر ہم دونوں کو گھور رہے تھے۔ مجھے حیرت ضرور تھی اور میں اس آدمی کے رویے پر الجھن میں ضرور مبتلا ہو گیا تھا لیکن یہ یقین تھا کہ اب والد خان سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔ یہی ہوا۔۔۔ والد خان جھپٹے ہوئے انداز میں آگے بڑھے اور آہستہ سے بولے۔ ”معاف کیجئے گا۔۔۔ مجھے غلط فہمی ہوئی تھی مگر میرا لڑکا آپ کا ہم شکل ہے۔“ ”ہو سکتا ہے۔۔۔ کوئی بات نہیں۔“ اس آدمی نے لا پرواہی سے کہا اور والد خان اپنے دوستوں اور اعزہ سمیت وہاں سے چلے گئے۔

اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اس نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور ایک طرف چلنے لگا۔ میں بھی تن بہ تقدیر چلا جا رہا تھا۔

ریلوے اسٹیشن سے باہر آکر اس نے ایک کار کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر پھر خاموش رہا۔ کہتا بھی کیا۔ اس نے جس انداز میں اس مذاق کو حقیقت کا رنگ دے دیا تھا اپنی مثال آپ تھا۔

اور اسی وقت میں نے سوچا کہ دنیا میں مجھ سے بھی زیادہ ستم ظریف لوگ کم نہ ہوں گے۔ کار تیز رفتاری سے شہر کی سڑکیں تاپ رہی تھی اور ہم دونوں خاموش تھے۔ ویسے میں بار بار آنکھیں پھاڑ کر اُسے گھورتا۔۔۔ اور سوچتا کہ وہ آخر گو نگا کیوں ہو گیا ہے۔

آخر گاڑی ایک عمارت کی کمپاؤنڈ میں داخل ہوئی۔ یہ کوٹھی بہت بڑی اور شاندار تھی۔ اس میں پائیں باغ کے ساتھ ہی ساتھ عقبی پارک بھی تھا اور ان کے گرد ہزاروں مربع گز کا احاطہ تھا۔ میں نے سوچا خدا اصلی باپ تو اس حیثیت کا نہیں تھا مگر نقلی بھائی۔۔۔ نقلی بھائی مجھے ایک شاندار کیڈیلاک کار میں یہاں تک لایا تھا۔ میں چھانک پر لگی ہوئی نیم پلیٹ بھی نہ پڑھ سکا۔

کچھ دیر بعد وہ ایک ملازم سے کہہ رہا تھا۔ ”انہیں ہاتھ روم وغیرہ دکھاؤ اور ان کا سامان

مہمان خانے میں پہنچا دو۔“

اور پھر مجھے معلوم ہوا کہ وہ کون تھا۔ آج کارنل فریدی جو اس وقت انسپکٹر فریدی کہلاتا تھا۔ مگر ایک انسپکٹر کے یہ ٹھاٹھ باٹھ دیکھ کر مجھے بڑی حیرت ہوئی تھی اور میں نے سوچا تھا کہ یہ آدمی آخر کتنا بڑا راشی ہے اور اسے کتنی رشوت ملتی ہے۔ کیا حکام بالا کو اس ترک و احتشام کی خبر ہی نہیں ہے۔

شام تک میں نے کرنل سے کچنی بات کہہ دی۔ وہ بن کر کافی محفوظ ہوئے۔ لیکن انہوں نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ مجھے اپنے باپ سے ملنا چاہئے۔ یا میں نے غلطی کی ہے۔ میرے سامنے مستقبل کے لئے کوئی پروگرام نہیں تھا۔ اگر نہیں تھا تو مجھے اس کی پرواہ بھی نہیں تھی۔ میں تو ان دنوں خود کو قدیم یونان کے فرقہ کلیبیہ کا ایک فرد سمجھنے لگا تھا۔ خود کرنل ہی نے میرے سامنے مستقبل کے لئے ایک پلان رکھا۔ ان کا خیال تھا چونکہ میں ملٹری کی سیکرٹ سروس سے منسلک رہ چکا ہوں اس لئے ان کے محکمے میں میرے لئے ضرور گنجائش نکل آئے گی۔

اور ایسا ہی ہوا۔ مجھے اسٹنٹ سب انسپکٹر کا رینک مل گیا۔ لیکن ملٹری کے عہدے کے مطابق میں سار جٹ حمید ہی کہلاتا رہا۔ کرنل نے مجھے شروع ہی سے اپنی ماتحتی میں رکھا تھا۔ ملازمت ملنے کے بعد ہی میں نے ایک علیحدہ مکان کرایہ پر حاصل کر لیا اور وہیں رہنے لگا۔ لیکن زیادہ دنوں تک ایسا نہیں ہو سکا۔ کرنل نے مجھے مجبور ہی کر دیا کہ میں رہوں بھی ان کے ساتھ۔ اور پھر اس کے بعد کی زندگی سے تو آپ واقف ہی ہیں۔ لیکن شاید آپ کو یہ نہ معلوم ہو کہ ایک بار کرنل ہی مجھے میرے گھر لے گئے تھے اور والد خان نے اس سلسلے میں ایک بہت بڑا جشن برپا کیا تھا۔ صلح صفائی ہوئی لیکن یہ حقیقت ہے کہ اب گھربار سے طبیعت اچاٹ ہو گئی تھی۔

پھر آہستہ آہستہ میری کایا پلٹ ہوتی گئی۔ میں کرنل کا احسان مند ہوں کہ انہوں نے مجھے آدمی بنادیا۔ غالباً اسی لئے انہوں نے مجھے اپنے ساتھ رکھا تھا۔ میری اصلاح کے لئے ایسے نفسیاتی پہلو اختیار کرتے کہ مجھے بھی خبر نہ ہوتی۔ شراب چھوٹی اور ان مایوسیوں کے تانے بانے میرے ذہن سے غائب ہوئے جن کا تعلق مستقبل سے تھا۔

مگر صرف ایک بات پر آج تک ان سے متفق نہ ہو سکا وہ بات آپ سے بھی پوشیدہ نہیں۔

جی ہاں۔۔۔ وہی یلا ملیوں والا معاملہ۔۔۔ اور یہ بھی سن لیجئے کہ اپنے قلم سے اس کا اعتراف کرتے ہوئے مجھے شرم نہیں آتی۔ شرم یوں نہیں آتی کہ آج تک میرے قدم دوستی سے آگے نہیں بڑھے۔ میں لڑکیوں میں بیٹھ کر کہیں مارنے کا شائق ہوں۔ مجھے ان سے عشق نہیں ہو جاتا۔

ابو ہو مگر ٹھہریے۔ شاید آپ شہناز کی مثال پیش کریں۔ تو میں آپ کی خدمت میں یہ اطلاع پیش کرتا ہوں کہ میں اس زمانے میں جب شہناز سے ملاقات ہوئی تھی بالکل اناڑی تھا۔ پھر بھی میں اس سے شادی کر ہی لیتا۔ مگر خدا ان وکیل صاحب کو (مرنے کے بعد) جنت نصیب کرے جنہوں نے مجھے بال بال بچا لیا۔۔۔ شہناز کو وہ اڑا لے گئے۔ میرے دوست ہی تھے میں نے ہی شہناز سے ان کا تعارف کرایا تھا۔ شہناز نے محسوس کیا کہ وہ اس وکیل کے ساتھ زیادہ خوش رہے گی جو ہزاروں روپے ماہوار کما تا تھا۔ میں بچارہ تو ایک اسٹنٹ سب انسپکٹر تھا۔ اور آج تک ہوں۔۔۔ یہ اور بات ہے کہ حکومت کے صرف خاص سے مجھے اب اتنے الاؤنسز ملتے ہوں کہ میری تنخواہ اپنے محکمے کے ڈی۔ آئی۔ جی کی تنخواہ سے بڑھ گئی ہو۔ مگر شائش ہے کرنل کو، وہ آج بھی اتنی ہی تنخواہ لے رہے ہیں جتنی ایک انسپکٹر کی ہوتی ہے انہوں نے الاؤنسز لینا بھی منظور نہیں کیا۔ ورنہ ان کی تنخواہ آئی جی سے بھی زیادہ ہوتی۔

ہاں تو میں شہناز کا تذکرہ کر رہا تھا۔ وہ تو بہت خوش رہتی ہے لیکن وکیل صاحب ہر وقت اس کا بلی کا سامنہ بناتے رہتے ہیں جسے طوہ سوہن کے بجائے دھوکے میں بار سوپ خرید کر کھانا شروع کر دیا تھا۔

بہر حال یقین کیجئے کہ میرا وہ عشق جذباتی بوکھلاہٹ کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔۔۔ جی ہاں۔۔۔ چلنے یہی سہی۔۔۔ انگو رکھنے ہیں۔ اگر میٹھے بھی ہوتے تو آپ کا کیا بھلا ہوتا۔ چلنے میں تھپ ہی مٹا رہا ہوں۔ اچھا بس اب خاموش۔ کہانی سننے جس کے لئے اتنے صفحات سیاہ کئے ہیں۔

وہ ایک حسین شام تھی۔۔۔ جی ہاں گھبراہٹ نہیں۔ میں اسی طرح لکھنے کی کوشش کروں گا جیسے ناول نویس حضرات لکھتے ہیں۔۔۔ یعنی وہ ایک ایسی شام تھی جو کسی ناول نویس ہی کو اپنی طرف متوجہ کر سکتی تھی۔ ورنہ عام آدمی کو اتنی فرصت کہاں کہ وہ شفق کا عطر کشید کر کے ملکہ شب کے لباس زر نگار میں لگائے۔ یا شفق کے رنگ اسے ایسے معلوم ہوں جیسے افق نے اس کی



طرف دیکھتی اور کبھی نیلم کی طرف۔ میرا دل چاہا کہ نیلم کی دونوں چوٹیاں پکڑ کر اس وقت زور لگاتا رہوں جب تک کہ اس کا سر اٹھنے کے پھلکے کی طرح شفاف نہ ہو جائے۔

اگر بات یہیں ختم ہو گئی ہوتی تو میں اسے اپنے تہمتوں پر رکھ کر برابر کرنے کی کوشش کرتا.... مگر وہ تو سر جانے کی حد تک بڑھ کر کے آئی تھی۔

اتنی جلدی اس نے اپنے چہرے کے آثار بدلے کہ میں متحیر رہ گیا۔ اس کے ہونٹ کانپ رہے تھے اور چہرہ دھواں ہو گیا تھا۔ آنکھیں ڈبڈبا آئی تھیں۔

اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”پاپا مئی پر ہارٹ ایک ہوا ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ وہ ایک گھنٹہ سے زیادہ نہ چلیں گی اور تم یہاں تفریح کر رہے ہو۔ پاپا.... اتنے ظالم نہ بنو۔“

یوریشین لڑکی کا منہ حیرت سے کھل گیا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ کچھ کہتی میں خود ہی بوکھلا کر اٹھ گیا۔

”معاف کرنا....!“ میں نے اس سے کہا۔ ”میں ابھی آتا ہوں۔“

اور نیلم کو پیچھے ہی چھوڑ کر خود وہاں سے نکل آیا.... پھر میں نے یہ بھی نہیں دیکھا کہ وہ وہیں رکی تھی یا میرے پیچھے لوٹ آئی تھی۔

اس مرض کا کوئی علاج نہیں ہے۔ کرنل کو وہ انکل کہتی ہے اور اُن کا بے حد احترام کرتی ہے۔ لیکن مجھے پاپا کہنے کے باوجود بھی چٹکیوں میں اڑاتی ہے۔ ویسے میں اس سے صرف اتنا ہی چاہتا ہوں کہ گھر پر وہ مجھے بابا، نانا، دادا یا جو کچھ بھی دل چاہے کہہ سکتی ہے۔ مگر باہر اسے اس معاملے میں سنجیدہ رہنا چاہئے۔ نہیں سنتی، نہیں مانتی۔ اب میں نے سوچا ہے کہ اس سے دور چلا جاؤں.... بہت دور.... افق کے پار وغیرہ.... جہاں.... لا حول ولا قوۃ پھر بہک گیا۔ میں تو آپ کو ایک کہانی سنانے جا رہا تھا۔

بہر حال وہی شام تھی جب اس کہانی کا آغاز ہوا۔ مجھے یہی اطلاع ملی تھی کہ کرنل اس وقت لاہور میں موجود ہیں۔ لیکن انہوں نے مجھے تجربہ گاہ سے بلوا بھیجا۔ ان کی تجربہ گاہ اوپری منزل پر ہے۔

میں اوپر پہنچا لیکن تجربہ گاہ میں قدم رکھتے ہی چکر سا آ گیا۔ سامنے ہی بڑی میز پر ایک آدمی کی لاش پڑی ہوئی تھی جس کا پیٹ پھٹ گیا تھا۔ آنتیں باہر آ گئی تھیں اور تازہ تازہ خون میز پر

محبوبہ خاص الخاص کی اوڑھنی چرائی ہو۔ یا اور کچھ.... شام پر تو شاعری ہوتی ہے۔ نثر میں بھی بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے مگر زبان سے نہیں کہا جاسکتا۔ کیوں کہ آپ یہی سب کچھ کسی چوراسے پر کھڑے ہو کر کہنا شروع کر دیں تو ٹریفک کا ٹریفک کسی قریبی دوا فروش کی دکان سے تھانے کو ضرور فون کرے گا کہ یہاں ایک بزرگوار ٹریفک کی نقل و حرکت میں خلل انداز ہو رہے ہیں اور پھر آپ کو وہاں پہنچا دیا جائے گا جہاں آپ ہی جیسے ہزاروں بھلے آدمی موجود ہوں گے۔ لیکن آپ ان کی نثر سننے سننے تک آکر شاعری شروع کر دیں گے۔ لیجئے میں پھر بہک گیا۔ بس اپنی کہانی خود ہی لکھتے وقت یہی دشواری آپڑتی ہے۔ مگر میں بہر حال لکھنا چاہتا ہوں۔ خواہ آپ بور ہوں خواہ پڑھ کر بنگلیں بجائیں۔

وہ ایک شام ہی تھی اور مجھ پر گھر سے نکل بھاگنے کا جنون طاری تھا۔ کرنل لاہور میں تھے اور نیلم میرے سر پر سوار تھی۔ نہ جانے کیوں کرنل نے مجھے گھر پر روک رکھا تھا۔ نیلم نے میری زندگی تلخ کر کے رکھ دی تھی اور میرا یہی دل چاہتا تھا کہ اسے یا تو جان سے مار دوں یا خود اپنی ہی گردن میں پھنسا ڈال کر ہمیشہ کے لئے اس سے پیچھا چھڑا لوں۔

اب آپ ہی بتائیے ایسی باتیں کس طرح برداشت کی جاسکتی ہیں۔ کچھ دن پہلے کی بات ہے میں ہائی سرکل ٹائٹ کلب میں ایک نئی دوست بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ ایک یوریشین لڑکی تھی اور اس کے ہونٹ مجھے بہت پسند تھے۔ وہ جب مسکراتی تو اس کے گالوں میں خفیف سے گڑبے پڑ جاتے تھے۔ مجھے ایسی مسکراہٹ والی لڑکیاں بہت اچھی لگتی تھیں۔ پتہ نہیں کیوں۔

بہر حال میں اور وہ ایک میز پر تھے اور ہم میں کتوں کی اقسام پر گفتگو ہو رہی تھی کہ یکایک نیلم آچکی۔ مجھے دیکھتے ہی لپک کر میز کی طرف آئی اور بولی۔

”اوہ.... فادر.... میں تمہیں کہاں کہاں ڈھونڈھ آئی ہوں۔“

میں بوکھلا گیا۔ ہزاروں بار سمجھا چکا تھا کہ باہر مجھے فادر یا بابا کہہ کر مخاطب نہ کیا کرے۔ مگر وہ نیلم ہی کیا جو چکنا گھڑا نہ ہو۔ آپ خود سوچئے۔ آپ ایک جوان آدمی ہیں اور ایک جوان لڑکی آپ کو بابا کہنے لگے۔ کیا آپ یہ نہ سوچیں گے کہ کاش آپ بابا ہونے سے پہلے ہی مر جاتے۔ یا اتنی لمبی چوڑی بے بی سر سے پیدا ہی نہ ہوتی۔

نیلم کے لمبے مین سنجیدگی تھی اس لئے وہ یوریشین لڑکی متحیر نظر آنے لگی۔ کبھی وہ میری

مگر آنکھیں بند تھیں۔

اور میں یکنخت بھاگ نکلنے کی پوز میں آ گیا تھا۔

کرنل نے مجھے وہیں ٹھہرنے کا اشارہ کیا اور وہ لاش کی طرف بڑی دلچسپی سے دیکھتے رہے۔ میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن آواز حلق میں پھنس کر رہ گئی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اس منظر کو تفریح کے کس خانے میں فٹ کروں۔ کیونکہ کرنل کے چہرے پر تو اس قسم کے آثار تھے جیسے وہ اس سے بہت زیادہ لطف اندوز ہو رہے ہوں۔

میں نے ایک بار پھر آنکھیں سے لاش کی طرف دیکھا۔ اس کی آنتیں پیٹ کے اندر جا چکی تھیں اور پیٹ کی سطح حیرت انگیز طور پر برابری ہو گئی تھی۔ کہیں بھی شکاف یا زخم کا نشان نہیں نظر آتا تھا۔

اس شخص کے خدوخال چینیوں کے سے تھے۔ جسم گھٹیا اور قد معمول سے کچھ چھوٹا تھا۔ عمر کا اندازہ لگانا مشکل تھا کیونکہ کبھی وہ نوجوان معلوم ہوتا تھا اور کبھی ادھیڑ۔

دفعتاً اس نے آنکھیں کھول دیں اور حمید کو دیکھ کر کچھ چوک سا پڑا۔

”میرے اسٹنٹ کیپٹن حمید.... مسٹر چیانگ....!“ فریدی آہستہ سے بولا۔

”اوہ....!“ چینی نے مسکرا کر حمید کی طرف دیکھتے ہوئے سر کو خفیف سی جنبش دی پھر ایک طویل انگرائی کے ساتھ جمائی لیتا ہوا بولا۔ ”یہ اور ایسے بہترے شعبہ کے کرنل۔ آپ کا کیا خیال ہے۔“

”بہت خوب۔“ کرنل مسکرائے۔ ”مگر مسٹر چیانگ یہ کتنا بڑا عذاب ہے کہ خواہ مخواہ ایک فالٹو وزن اٹھائے پھر دے۔“

”میں عادی ہو گیا ہوں کرنل۔“

”حمید! آپ فارموسا کی سیکرٹ سروس کے چیف مسٹر کاؤپی چانگ ہیں.... میرے پرانے دوست۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔“ میں لمبی لمبی سانسیں لیتا ہوا بولا۔ ”لیکن کیا ابھی یہ آپ کو یقین دلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ یہ اب بھی دوست ہیں۔“

”اوہو.... ہو.... ہو....“ چینی ہونٹوں کو دائرے کی شکل میں لا کر ہنسا۔ پھر بولا۔ ”یہ تو

چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔

## لاش کی انگڑائی

میں جہاں تھا وہیں رک گیا۔ کبھی میں کرنل کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی لاش کی طرف۔ کرنل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور وہ اتنے مزے میں سگار کے کش لے لے کر دھواں بکھیر رہے تھے جیسے انواع و اقسام کی شیرینی کے کسی خوان کے قریب کھڑے ہوں۔ مجھے دیکھ کر انہوں نے اپنے سر کو خفیف سی جنبش دی۔ مطلب یہ تھا کہ اُن کے قریب آ جاؤں۔

”اس لاش کے متعلق کیا خیال ہے۔“ انہوں نے کلائی کی گھڑی دیکھتے ہوئے پوچھا۔ پھر لاش کی نبض پر ہاتھ رکھ دیا۔

”لاشوں کے متعلق کیا خیال ظاہر کروں۔ مگر یہ یہاں کیسے آئی۔“

اور پھر دفعتاً چھل کر میں پیچھے ہٹ آیا۔ کیونکہ لاش کے ہاتھوں میں حرکت ہوئی تھی۔

میری آنکھیں حلقوں سے ابل پڑیں۔ لاش کے ہاتھ باہر نکلی ہوئی آنتیں سمیٹ سمیٹ کر

پھٹے ہوئے پیٹ میں بھر رہے تھے۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کانپنے لگوں یا چیخ مار کر بیہوش ہو جاؤں۔ دوسری ہی صورت بہتر معلوم ہوئی۔ بیہوش ہی ہو جانے میں عافیت تھی۔ کیونکہ اگر وہ لاش اپنی آنتیں پیٹ میں بھر لینے کے بعد ”مان مرا احسان ارے نادان کہ میں نے تجھ سے کیا ہے پیار“ گانا شروع کر دیتی تو میں کیا کرتا۔

”ٹھک.... کیا میں بیہوش ہو جاؤں۔“ میں نے کرنل سے پوچھا۔

کرنل ہنس پڑے۔ پتہ نہیں میری بوکھلاہٹ پر ہنسے تھے یا کوئی اور بات تھی۔

اب میں نے دیکھا لاش اپنا پیٹ برابر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ دونوں ہاتھ بڑی سرعت سے پیٹ پر مالش سی کر رہے تھے اور پھر وہ میز پر اس طرح آنکے جیسے لاش اٹھ کر بیٹھنے والی ہو۔

”اجنبی عورتوں سے گفتگو کرتے وقت ہکلاتے تو نہیں ہیں۔“

”نہیں....!“ میں نے کہا۔ ”بشرطیکہ ان کی آنتیں پیٹ کے باہر نہ ہوں۔“

وہ پھر ”ہو ہو“ کر کے ہنسا۔ اس کے ہنسنے کا انداز مجھے قطعی پسند نہیں آیا تھا۔

”مجھے یقین ہے کہ یہ کام ان کے علاوہ اور کوئی انجام نہ دے سکے گا۔“ کرمل نے کہا۔

میں نے سوچا آج تو ایک انہونی ہو رہی ہے۔ یعنی کرمل میرے متعلق کسی کو یقین دلارہے ہیں کہ میں یعنی حمید (جس کا دماغ ہر وقت کھوپڑی کے گرد منڈلایا کرتا ہے) کوئی کام بھی انجام دے سکو گا.... لیکن میں نے وضاحت نہیں چاہی۔ ضرورت بھی کیا تھی۔ اگر کرمل کوئی کام مجھ سے لینا ہی چاہتے ہوں تو میرے فرشتے بھی اس سے پہلو تہی نہیں کر سکتے۔ پھر وضاحت کے لئے بے چینی فضول تھی۔ مگر وہ لاش.... مگر یہ کاؤپی چانگ کیا بنا تھا۔

”لیکن کرمل....!“ کاؤ تھوڑی دیر بعد بولا۔ ”مجھے توقع تھی کہ آپ خود ہی اس میں دلچسپی لیں گے۔“

”میں یقیناً دلچسپی لے رہا ہوں مسٹر چانگ۔“ کرمل نے کہا۔ ”مگر اس سلسلے کے کچھ کام صرف کیپٹن حمید ہی کر سکیں گے۔ مثلاً یہ کہ مجھے عشق کرنے کا سلیقہ نہیں ہے۔ کیپٹن حمید آئے دن ریکارڈ توڑتے رہتے ہیں۔“

”گر امو فون کے“ میں نے آہستہ سے کہا اور پھر مجھے مسٹر کاؤپی چانگ کی ”ہو ہو“ سننی پڑی۔ میں نے تہیہ کر لیا کہ اب کوئی ایسی بات نہیں کروں گا جس پر مسٹر کاؤپی چانگ کو ہنسنا پڑے۔ مگر میری الجھن بڑھتی جا رہی تھی اور میں بار بار اس خون کی طرف دیکھ رہا تھا جو میز پر پھیلا ہوا تھا۔

”پھر مجھے کیا کرنا چاہئے۔“ مسٹر چانگ نے پوچھا۔

”آپ کیپٹن کو اپنے ساتھ لے جائیے۔“

”لیکن میں اپنی آنتیں دوبارہ اپنے پیٹ میں بھر لینے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔“ میں بول پڑا۔

”اوہ.... تم اس کی پرواہ نہ کرو۔“ کرمل نے مجھ سے کہا۔ ”وہ محض اک شعبہ تھا۔ مسٹر کاؤ

جس دم کے ماہر ہیں۔ وہ گھٹوں مردوں کی طرح پڑے رہ سکتے ہیں.... اور....!“

کرمل خاموش ہو کر مسکرائے.... پھر بولے۔ ”اور یہ دو ہر اپیٹ رکھتے ہیں۔“

ایک شعبہ تھا۔“

پھر وہ سنجیدہ نظر آنے لگا۔ میز سے اتر کر وہ ایک کرسی پر آ بیٹھا اور میں اسے اس طرح دیکھتا رہا جیسے وہ ابھی ہوا میں تحلیل ہو جائے گا۔

جس کرسی پر وہ بیٹھا تھا اسی کے قریب ہی ایک چھوٹا سا ہینڈ بیگ رکھا ہوا تھا۔ اس نے اسے اٹھا کر کھولا اور ایک عجیب و غریب کاپاپ نکال کر اس میں سیاہ رنگ کی ایک گولی ڈالی اور پھر دیاسلائی لگاتے ہی سارا کمرہ تیز قسم کی بوسے بس گیا۔ دھوئیں کی کثیف بادل اس کے ہونٹوں سے نکل کر فضا میں منتشر ہو گئے۔

اس نے پے درپے دو تین گولیاں پی ڈالیں اور پھر کرسی کی پشت سے ٹک کر آستین سے ہونٹ صاف کئے۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔

وہ کرمل کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور پھر میری طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت وہ نجائے کیوں سو فیصدی احمق معلوم ہو رہا تھا۔

کچھ بھی ہوا میں بھی تک اسی الجھن میں مبتلا تھا۔ ایک لاش جس کی آنتیں باہر نکل آئی ہوں اور.... وہ لاش اب ہنس رہی تھی۔ انیون پی رہی تھی۔ گفتگو کر رہی تھی اور کرمل نے اس لاش کا نام کاؤپی چانگ بتایا تھا۔ میں نے میز کی طرف دیکھا جس پر اب بھی خون پھیلا ہوا تھا۔

کرمل حسب معمول سگار پی رہے تھے اور کچھ سوچ رہے تھے۔ دفعتاً انہوں نے چانگ کو ”طرب کر کے کہا۔“ یہی وہ آدمی ہے جس کا تذکرہ میں نے آپ سے کیا تھا۔ مسٹر چانگ۔“

چانگ نے مجھے اس طرح دیکھا شروع کیا جیسے اب پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

”ہاں....!“ وہ کچھ سوچتا ہوا بولا۔ ”ان میں مجھے کچھ ایسی ہی خصوصیات نظر آرہی ہیں مگر کرمل کیا یہ ایک مستقل مزاج آدمی ہیں۔“

”ہوں یا نہ ہوں۔“ کرمل میری آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مسکرائے۔ ”لیکن اس معاملے میں بے حد مستقل مزاج ثابت ہوں گے۔“

”کس معاملے میں۔“ میں نے پوچھا۔

”ٹھہریئے....!“ کاؤپی چانگ ہاتھ اٹھا کر بولا۔ ”کیا آپ عشق کر سکتے ہیں۔“

”پندرہ ہزار میل فی گھنٹے کی رفتار سے۔“ میں نے جواب دیا۔



گفتگو انگریزی میں ہو رہی تھی۔ کاؤ نے پھر ”ہو ہو“ شروع کر دی تھی۔ تھوڑی دیر تک ہنستا رہا پھر بولا۔ ”کیپٹن ادھر دیکھئے۔“

اس نے پیٹ کھول دیا تھا۔ ناف میں دو انگلیاں ڈال کر اسے کھینچتا چلا گیا اور ایک بار پھر اس کی آنتیں باہر نکل پڑیں۔ میں کانپ گیا۔ وہ پھر ہنسنے لگا تھا۔

ایک بار تو میں نے آنکھیں بند ہی کر لیں۔ میں خائف نہیں تھا بلکہ اس منظر سے کراہت محسوس ہوتی تھی۔ اس نے پھر آنتیں سمیٹ کر اندر کر لیں اور جس سوراخ سے آنتیں باہر آئی تھیں اس نے سمت کر ناف کی شکل اختیار کر لی۔

”یہ پلاسٹک کا مصنوعی پیٹ ہے اور آنتیں بھی پلاسٹک ہی کی ہیں۔“ کرئل بولے۔ ”اور اس پلاسٹک کے پیٹ میں بکرے کا خون بھرا ہوا تھا۔“

کاڈاٹھ کر دوسری طرف مڑ گیا اور اس نے پشت سے قمیض اٹھائی۔ اس کی پشت پر تین پٹیاں سی نظر آئیں اور کرئل بولے۔ ”یہ مصنوعی پیٹ اس طرح اصل پیٹ پر منڈھ لیا جاتا ہے۔“

”مگر اس کی ضرورت ہی کیا ہے۔“ میں نے کہا۔

”مائی ڈیر کیپٹن“ کاؤ میری طرف مڑ کر بولا۔ ”اسی پیٹ نے کئی بار میری جان بچائی ہے۔ جب نیشلسٹ چین کا زوال ہو رہا تھا ایک بار میں ایک ندی کے کنارے دشمنوں میں گھر گیا۔ تھوڑی دیر تک تو لڑتا رہا پھر آنتیں نکال کر ڈھیر ہو گیا۔ انہوں نے مردہ سمجھ کر ندی میں پھینک دیا اور پھر میرا یہ مصنوعی پیٹ لائیٹ بیلٹ بن گیا۔“

”لائٹ بیلٹ....!“ میں نے حیرت سے دہرایا۔

”ہاں لائف بیلٹ.... یہ دیکھئے۔“

اس نے پھر قمیض اٹھا کر ناف میں پوری انگلی ڈال دی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ اندر کوئی چیز ٹٹول رہا ہو۔ پھر میں نے دیکھا کہ ایک پتلی سی ربر کی ٹنگی باہر نکلتی چلی آرہی ہے۔ اس نے ٹنگی کا سرا ہونٹوں میں دبا کر پھونکنا شروع کیا اور اس کا پیٹ پھولنے لگا۔ پھر اچھی خاصی تو ند نکل آئی۔ اب اس نے ٹنگی میں ایک گرہ دے کر جھوڑ دیا۔

”یہ دیکھئے۔“ اس نے کہا۔ ”اگر تیرے تیرے بازو شل ہو جائیں اور میں ہاتھ روک لوں تب بھی نہیں ڈوب سکتا۔ یہ حاملہ کا پیٹ مجھے پانی کی سطح پر ہی رکھے گا۔“

اور پھر اس نے ”ہو ہو“ شروع کر دی۔ یوں ہی خواہ مخواہ ہنستا رہا اور میں سوچتا رہا کہ کاش میں اس کے حلق میں کپڑا ٹھونس سکتا۔

”تو کیپٹن آپ میرے ساتھ چلنے کے لئے تیار ہیں۔“ اس نے تھوڑی دیر بعد کہا۔

”کہاں....!“

”جہاں میں لے چلوں۔“

”مگر میرے پاس ایسی لائیٹ بیلٹ نہیں ہے جو حاملہ کا پیٹ بن کر میری جان بچا سکے۔“ میں نے کہا۔

میں نے یہ بات کہنے کو تو کہہ دی مگر پھر بے حد افسوس ہوا۔ کیونکہ اس کی ”ہو ہو“ ایک بار پھر ”چالو“ ہو گئی تھی۔

”تم اپنے ساتھ اپنے بہترین سوٹ لے جاؤ۔“ کرئل بولے۔ ”اور جتنی بھی آرائشی مصنوعات لے جا سکتے ہو ضرور لے جاؤ۔“

میں نے بے بسی سے سر ہلا دیا۔

”بس جاؤ تیاری کرو۔ تمہیں جو کچھ بھی کرنا ہے وہ مسٹر چانگ سے معلوم ہو جائے گا۔“ طبیعت بھنجھلا گئی اور میں نے سوچا اچھا بیٹا چانگ تم بھی کیا یاد کرو گے.... یاد کرو گے اور سر پکڑ کر روؤ گے.... تمہیں بھی مرنے کے لئے یہی جگہ پسند آئی تھی۔

پتہ نہیں کیا قصہ تھا۔ کہاں جانا تھا۔ کس سے عشق کرنا تھا اگر وہ کوئی چینی ہی لڑکی ہوئی تو کیا کروں گا۔

”میں نیچے آکر روانگی کی تیاری کرنے لگا۔ یہ تیاری بھی ایسی ہی تھی جیسے ہزاروں میل لمبا سفر درپیش ہو۔ ایسی صورت میں جب کچھ معلوم ہی نہ ہو، اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ نہ کام کی نوعیت کا علم تھا اور نہ یہی پتہ تھا کہ جانا کہاں ہے۔ شروع شروع میں مجھے کرئل کا یہ طریق کار سخت ناپسند تھا۔ مگر آہستہ آہستہ مجھے احساس ہوتا گیا کہ کرئل ہر معاملے میں نفسیاتی طریقوں کو بروئے کار لاتے ہیں۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ اگر کسی کیس کی تفصیلات کا علم پہلے ہی سے ہو جائے تو پھر کام کرنے میں وہ سرگرمی باقی نہیں رہ جاتی جو کسی الجھی ہوئی ڈور کے سلجھانے کے سلسلے میں ہونی چاہئے۔ آج میں آپ کو حقیقت بتا رہا ہوں کہ کرئل کے ساتھ کام کرنے میں مجھے

وہی لطف حاصل ہوتا ہے جو آپ کو کسی اچھی قسم کے جاسوسی ناول سے حاصل ہوتا ہے۔ ایک ایک کر کے گرہیں کھلتی ہیں۔ ایک کھلی کہ دوسری سامنے موجود ہے۔ اب اسے بھی کھولے کہ تیسری حاضر ہے۔ بہر حال یہ ساری گرہیں غیر متوقع طور پر سامنے آتی چلی جاتی ہیں اور سرگرمی بڑھتی رہتی ہے۔ اگر ان گرہوں کی مجموعی تعداد کا علم پہلے ہی سے ہو جائے تو کیا یہ دلچسپی باقی رہے۔ میرا خیال ہے کہ میں تو بور ہو کر مر جاؤں۔ بس یہ ناول کا سا انداز ہی مجھے دلچسپی لینے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔ ویسے میں بظاہر کڑل پر تاؤ ہی کھاتا رہتا ہوں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مجھے اپنا یہ پیشہ بے حد پسند ہے۔

آپ مجھے کام چور سمجھتے ہیں۔ اس کی تمام تر ذمہ داری ہمارے تذکرہ نویس صاحب پر ہے۔ ممکن ہے انہوں نے مجھے غلط سمجھا ہو۔ یا محض صفحات بھرنے کی خاطر میری اکتاہٹوں اور کام چوری کا تذکرہ لے بیٹھے ہوں۔ میں نے جب بھی ان سے شکایت کی یہی بولے کہ جناب۔۔۔ زیب داستان کے لئے بھی تو کچھ ہونا ہی چاہئے۔ عام طور پر پڑھنے والے آپ کو کسی فلمی مسخرے ہی کے روپ میں دیکھنا چاہتے ہیں جو مار دھاڑ کی فلموں میں ہیر و کے ساتھ لگا رہتا ہے۔ بڑا غصہ آتا ہے ان کی اس بات پر لیکن کیا کروں خود کڑل ہی ان کا بہت خیال رکھتے ہیں اور انہوں نے آج تک اس پر اعتراض نہیں کیا کہ یہ حمید کا پٹھا آخر فلمی مسخرہ بن کر کیوں رہ جاتا ہے۔ یہ بات ضرور ہے کہ مجھے ہنسنے ہنسانے سے عشق ہے لیکن میں کڑل کو اتنا بور بھی نہیں کرتا جتنا ہمارے تذکرہ نویس صاحب بیان کر ڈالتے ہیں۔ خیر چھوڑیئے نہ وہ میری قبر میں لیٹیں گے اور نہ میں ان کی قبر میں لیٹوں گا۔

ہاں تو میں کاؤ پی چانگ کی بات کر رہا تھا۔ کیا مجھے یہ نہ سوچنا چاہئے تھا کہ آخر کاؤ مجھے یا کسی ملازم کو نظر آئے بغیر اوپر تجربہ گاہ میں کیسے پہنچ گیا تھا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد میری حیرت رفع ہو گئی جب میں نے اس بوڑھے کو دیکھا جو اکثر کڑل کے پاس آتا رہتا تھا اور میں یہ سمجھتا تھا کہ وہ ان کے والد مرحوم کا کوئی دوست ہو گا۔ کڑل اپنے والد کے دوستوں کا بے حد احترام کرتے تھے۔ بہر حال اب مجھے یہ معلوم ہوا کہ وہ بوڑھا کون تھا۔ وہ چانگ ہی تھا۔ اور ایک بوڑھے دیسی آدمی کے میک اپ میں کڑل سے ملتا رہتا تھا۔ اب آپ خود ہی سوچئے کہ میری کھوجی طبیعت کتنی بے چین ہوئی ہوگی۔

یہ تھا کڑل کا طریق کار۔۔۔ اب اگر اس وقت میں بستر مرگ پر بھی پڑا ہوتا تو یہی دل چاہتا کہ اس کاؤ پی چانگ کے پٹھے کے ساتھ ضرور جاؤں خواہ زندگی بھر ہی اس کی ”ہو ہو“ کیوں نہ سننی پڑے۔

چانگ کی کار کیا ونڈ میں موجود تھی۔ ایک معمولی سی گاڑی تھی بہر حال اس میں اس بوڑھے کی موجودگی سے شتر گر گئی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔

میں چانگ کے ساتھ کسی نامعلوم منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ ہم دونوں ہی خاموش تھے۔ میرا خیال تھا کہ ابھی یہ گاڑی شہر سے نکل کر کسی دیران راستے پر لگ جائے گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ وہ راجرس اسٹریٹ کی ایک عمارت کے سامنے رک گئی۔ خود چانگ ہی اُسے ڈرائیو کر کے یہاں تک لایا تھا۔

”اٹر چلو کیپٹن۔۔۔!“ چانگ آہستہ سے بولا اور میں اپنا سوٹ کیس سنبھالتا ہوا نیچے اتر آیا۔ ہم ایک شاندار عمارت کے برآمدے میں کھڑے تھے۔ چانگ نے اطلاعی گھنٹی کا بٹن دبایا اور عمارت کے کسی دور افتادہ حصے سے ”ٹرن۔۔۔ ٹرن!“ کی مذہم سی آواز آئی۔

کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک مجبول بے آدمی نے سر نکال کر باہر جھانکا اور پھر ایک طرف ہٹ گیا۔ ہم دونوں عمارت میں داخل ہوئے۔ پی چانگ نے چینی زبان میں اس آدمی سے دو منٹ تک گفتگو کی اور پھر آگے بڑھتا چلا گیا۔ دروازہ کھولنے والے نے سوٹ کیس میرے ہاتھ سے لے لیا تھا۔ یہ ایک طویل راہداری تھی۔ دفعتاً پی چانگ نے میری طرف مڑ کر کہا۔ ”کیپٹن آپ اس کے ساتھ اپنے کمرے میں جائیے، میں کچھ دیر بعد آپ سے دہیں ملوں گا۔“

ملازم مجھے جس کمرے میں لایا وہ صاف ستھرا اور کافی کشادہ تھا۔ ایک طرف ایک مسہری موجود تھی۔ جس پر شفاف بستر تھا۔ دو الماریاں تھیں۔ ایک میز۔۔۔ ایک لکھنے کی کرسی اور دو آرام کرسیاں۔ ملازم نے سوٹ کیس ایک طرف رکھ دیا اور اس طرح کھڑا ہو گیا جیسے میرے کسی حکم کا منتظر ہو۔ میرے خیال سے وہ بھی چینی ہی تھا۔ لیکن میک اپ نے اسے اسی طرف کا آدمی بنا دیا تھا یہ اور بات ہے کہ آنکھوں کی اصلاح کسی طرح بھی نہ سکی ہو۔

”کیا ہے۔“ میں نے جھنجھلا کر پوچھا۔ مجھے نہ جانے کیوں اس کی موجودگی گراں گذر رہی تھی۔ ”میں سوچ رہا تھا کہ پتہ نہیں آپ شغل کرنا پسند کریں یا نہ کریں۔“ اس نے انگریزی میں

کو ایفون سے رغبت نہیں ہے۔ وہ کبجٹ پنک میں آپ کو اطلاع دینا بھول گیا ہو گا۔ بہر حال ہم اس وقت ہوٹل ڈی فرانس میں کھانا کھائیں گے۔ میں بے حد شکر گزار ہوں گا اگر آپ لباس تبدیل کر لیں۔“

”میں یقیناً لباس تبدیل کر لوں گا۔ لیکن مسٹر چانگ کیا یہ سفر صرف ہوٹل ڈی فرانس کے کھانے ہی تک محدود رہے گا۔“

”نہیں کیپٹن.... آپ چلے تو۔ اگر آپ عاشق مزاج ہیں تو.... ہو ہو.... ہو ہو۔“

لعنت ہے میرے عاشق مزاج ہونے پر.... اگر میں کسی عشق کے لئے متواتر اس قسم کی ”ہو ہو“ سنتا ہوں۔ لیکن میں خاموش ہی رہا کیونکہ کرنل نے اس کا تعارف اپنے ایک پرانے دوست کی حیثیت سے کرایا تھا۔ ورنہ میں اسے بتاتا کہ کس طرح ہنسنا چاہئے۔ اس کی ہنسی مجھے غصہ بھی دلاتی تھی اور کوفت میں مبتلا بھی کرتی تھی۔ گفتگو کرتے وقت جیسے ہی اس کے ہونٹ دائرے کی شکل اختیار کرتے میرا دم نکل جاتا۔

ہم ٹھیک نو بجے ہوٹل ڈی فرانس پہنچے۔ چانگ نے شاید پہلے ہی سے میز مخصوص کرائی تھی۔ میز پر ریزرویشن کارڈ موجود تھا جس پر تحریر تھا۔ ”مسٹر پی۔ اے پکھا والا۔“

”مسٹر پی۔ اے پکھا والا۔“ میں نے آہستہ سے کہا اور اس کے ہونٹ دائرے کی شکل میں آنے کے لئے سکرٹے ہی تھے کہ میں نے ہاتھ اٹھا کر جلدی سے کہا۔ ”ٹھہریے مسٹر چانگ آپ کو ہنسی نہ آئے تو زیادہ بہتر ہے۔“

”کیوں؟“ اس کی آنکھوں سے حیرت جھانک رہی تھی۔

”بہت زیادہ ہنسنے والوں پر مجھے بے حد غصہ آتا ہے۔“

”مگر کرنل نے تو بتایا تھا کہ آپ ہنسنے ہنسانے کی بے حد شائق ہیں۔“

”آج ساڑھے چار بجے تک یقیناً تھا۔“

”کیا مطلب....؟“

”مطلب یہ کہ.... یہ کہ....؟“ سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہوں۔ کیا اس سے یہ کہہ دیتا کہ وہ ہونٹ سکڑ کر ہنسنے کی بجائے باچھیں پھاڑ کر اور دانت نکال کر ہنسا کرے۔ یقیناً یہ بات اسے گہرا صدمہ پہنچاتی۔ لہذا میں نے کہا۔ ”بات دراصل یہ ہے.... مسٹر چانگ کہ جب مجھے کوئی کام کرنا

جواب دیا۔

”کیسا شغل....؟“ میں اسے گھورنے لگا۔

”ایفون....؟“

”نہیں.... میں ایفونی نہیں ہوں۔ تمہارا بہت بہت شکریہ۔ تم جاسکتے ہو۔“

میرے ایفونی نہ ہونے پر اسے اتنی حیرت ہوئی کہ اس کا منہ کھل گیا اور اس کے پھپھوند لگے ہوئے زرد دانتوں پر نظر پڑتے ہی مجھے ابکائیاں سی آنے لگیں۔

”جاؤ.... خدا کے لئے۔“ میں ہاتھ ہلا کر بولا۔

”بہت اچھا.... جناب۔“ وہ مسکرایا۔ ”مگر اسے یاد رکھئے گا کہ یہ ماسٹر چانگ کا مکان ہے اور یہاں انہیں کا حکم چلتا ہے۔ آج تک کسی میں اتنی ہمت نہیں ہوئی کہ وہ ماسٹر چانگ کی پیشکش ٹھکرا سکے۔“

وہ چلا گیا اور میں بیٹھا اس پر دانت بیتا رہا۔

## شہزادے کی منگیت

چانگ کی ”کچھ دیر“ کا خاتمہ تقریباً دو گھنٹے بعد ہوا۔ میں اس دوران میں یہی محسوس کرتا رہا تھا جیسے میں نے سچے ایفون کی چمکی لگالی ہو۔

چانگ سیاہ سوٹ میں ملبوس تھا۔ لیکن اس نے میک اپ میں تبدیلی نہیں کی تھی۔ اس کی آنکھیں سرخ تھیں شاید اس نے ابھی ابھی کشیدنی ایفون کے دم لگائے تھے۔

”ہاں.... کیپٹن.... ارے آپ نے ابھی تک لباس تبدیل نہیں کیا۔“

”کیسا لباس؟“ مجھے غصہ آ گیا۔

”ارے.... کیا اس مردود نے آپ کو اطلاع نہیں دی تھی کہ ہم ہوٹل ڈی فرانس میں کھانا کھائیں گے۔“

”مجھے کسی مردود نے اطلاع نہیں دی۔“

”اوہ....؟“ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر بولا۔ ”آپ بہت اچھے ہیں کیپٹن کہ آپ

ہوتا ہے تو میں بے حد سنجیدہ ہو جاتا ہوں۔“

”مگر اس کام میں تو سنجیدگی سے کام نہ چلے گا۔“ چانگ نے تشویش کن لہجے میں کہا۔

”خیر.... میں سوچوں گا۔ فی الحال مجھے کھانے سے فراغت پالینے دیجئے۔“

کھانے کے دوران میں اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک ایسی لڑکی کا معاملہ تھا جو ہسنے ہنسانے کی بے حد شائق ہے۔ میں نے اسے یقین دلایا کہ اگر وہ ہنسنا ہنسانا پسند کرتی ہے تو میں اسے ہنسنا ہنسا کر مار ڈالوں گا۔ مگر اسے اطمینان نہیں ہوا۔ میں نے دل میں کہا۔ ”جہنم میں جاؤ.... پہلے میں اس لڑکی کو تو دیکھ لوں ہو سکتا ہے اسے دیکھ لینے کے بعد خود مجھے ہی کسی اندھے کونوں میں چھلا گئی ہو۔“

جی ہاں.... اگر وہ کوئی چینی یا جاپانی لڑکی ہوتی تو.... کیا آپ سمجھتے ہیں کہ میں.... خیر زندہ تو رہتا لیکن شاید زندگی بھر ہی نہ آتی۔

”مسٹر چانگ....“ میں نے پوچھا۔ ”کیا وہ کوئی چینی یا جاپانی لڑکی ہے۔“

”نہیں.... وہ ایک فرانسیسی لڑکی ہے۔“ چانگ نے فرانسیسی زبان میں جواب دیا۔

”اوہ.... جب تو ٹھیک ہے۔“ میں نے بھی فرانسیسی ہی میں کہا۔

”کرٹل نے یہ بھی بتایا تھا کہ آپ فرانسیسی بول سکتے ہیں.... اوہ.... وہ آگئی.... کیپٹن۔“

میری نظر بائیں جانب اٹھ گئی۔ وہ بھی اُدھر ہی دیکھ رہا تھا۔ میں نے کیا.... دیکھا؟ میرے خدا.... وہ کتنی حسین تھی۔ اگر میں حاتم طائی کے زمانے کا کوئی شہزادہ ہوتا تو یقیناً میں نے اپنا گریبان پھاڑ ڈالا ہوتا۔ کوئی اور نہ ملتا تو مسٹر چانگ ہی کو اٹھا کو بیچ دیتا پھر اس زور کا نعرہ مارتا کہ شہر بھر کی چھتیں اڑ جائیں۔ لیکن نہ وہ حاتم طائی کا زمانہ تھا اور نہ مسٹر چانگ ہی اس بات پر تیار ہوتے کہ میں انہیں اٹھا کر بیچ دوں۔

بہر حال وہ ایسی ہی حسین تھی کہ میں اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ وہ بہت حسین تھی۔ اس کے ساتھ دو مرد بھی تھے۔ پہلے میں ان دونوں کو چینی ہی سمجھا تھا مگر مسٹر چانگ نے بتایا کہ وہ انڈو چائینیز تھے۔ وہ جو کچھ بھی ہوتے میں انہیں اس خوبصورت لڑکی کے ساتھ دیکھنا پسند نہ کرتا۔

”کیپٹن اے اپنی طرف متوجہ کیجئے۔ اس سے غلطے.... عشق کیجئے.... یہ یونان کی سائیکی

ہے۔“ چانگ آہستہ سے بولا۔

”افیون سے توشوق نہیں کرتی۔“ میں نے پوچھا۔

”نہیں.... ہرگز نہیں۔ اگر یہ افیون استعمال کرتی ہوتی تو اس کی رنگت میں اتنا نکھار نہ

ہوتا۔ اوہ کیپٹن آپ اسے بہت آسانی سے اپنی طرف متوجہ کر سکیں گے۔ یہ انگریزی اور فرانسیسی یکساں طور پر بول سکتی ہے۔“

”لیکن سوال یہ ہے مسٹر چانگ کہ میں اس سے اپنے لئے عشق کروں گا یا آپ کے لئے۔“

چانگ نے ہسنے کے لئے ہونٹ سکڑے ہی تھے کہ میں نے بوکھلا کر کہا۔ ”مسٹر چانگ کیا آپ اپنے ہسنے کا انداز نہیں بدل سکتے۔“

”کیا مطلب....!“ چانگ پھر متحیر نظر آنے لگا۔ لیکن مجھے فوراً ہی جواب سوجھ گیا۔ میں نے

کہا۔ ”مسٹر چانگ آخر آپ کو میک اپ میں رہنے کی ضرورت کیوں محسوس ہوتی ہے۔“

”کیوں نہ ہو۔“ چانگ کے لہجے میں اب بھی حیرت کا عنصر موجود تھا۔ ”میں اس لئے میک

اپ میں رہتا ہوں کہ بعض لوگ مجھے پہچان نہ سکیں۔“

”کیا آدمی اپنے اطوار و عادات سے نہیں پہچانا جاسکتا۔“

”مثلاً....!“ چانگ اب بھی متحیر تھا۔

”مثلاً آپ ہونٹ سکڑ کر ہنستے ہیں۔ یہ ایک غیر معمولی عادت ہے۔ جو عام آدمیوں میں

نہیں پائی جاتی کیا آپ میک اپ میں باجھیں پھاڑ کر نہیں ہنس سکتے۔“

”اوہ....!“ چانگ یک بیک سنجیدہ نظر آنے لگا۔ پھر کچھ دیر بعد آہستہ سے بولا۔ ”میں یقیناً

غلطی پر تھا۔ آخر آپ کرٹل ہی کے اسٹنٹ تو ہیں۔“

پھر اس نے کرٹل کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے شروع کر دیئے۔ حالانکہ

اسے یہ خیال میں نے دلایا تھا۔ مگر سارا کریڈٹ کرٹل کو جا رہا تھا۔ جائے.... مجھے اس کی پرواہ نہ

تھی۔ میں تو متوازاں لڑکی کو دیکھے جا رہا تھا جو اب ایک میز پر بیٹھ گئی تھی۔ لیکن اس کے دونوں

ساتھی اس کے پیچھے والی میز پر تھے۔ وہ اس کے ساتھ نہیں بیٹھے تھے اور اس پر مجھے کافی خوشی

ہوئی تھی۔

”کیا وہ اس کے ملازم ہیں۔“ میں نے چانگ سے پوچھا۔



”ہاں.... باڈی گاڑ....!“

وہ لڑکی اپنی میز پر تنہا تھی اور میرے دل میں گدگدیاں سی ہو رہی تھیں۔

”کیا اسے کسی کا انتظار ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔“ چانگ سر ہلا کر بولا۔ ”وہ پچھلے کئی دنوں سے تنہا بیٹھ رہی ہے۔“

”اور اس سے پہلے۔“

”اس سے پہلے اس کے ساتھ ایک بوڑھا فرانسیسی ہوا کرتا تھا۔“

”اس کا باپ....!“

”پتہ نہیں۔“

میں نے سوچا کہ اس سے تفصیل کا تقاضہ کروں مگر پھر خاموش ہی رہا۔ کیونکہ ممکن تھا کہ نل ہی نے اسے تفصیل بتانے سے روک دیا ہو۔

”اچھا تو مسٹر چانگ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔“

”مسکراتا چاہئے۔“ چانگ میری آنکھوں میں دیکھتا ہوا شرارت آمیز لہجے میں بولا۔ ”ہنسنا

چاہئے.... قہقہے لگانا چاہئے۔ اگر اس کے ساتھ دو تین راتیں بھی بسر کر لیں تو آپ امر ہو جائیں گے کیپٹن۔“

اس نے پھر ہنسنے کے لئے ہونٹ سکڑے ہی تھے کہ میں نے ٹوک دیا اور اس پتھارے نے بڑی بے بسی سے اپنے ہونٹ بند کر لئے۔

میں نے کہا۔ ”مسٹر چانگ عشق ممکن ہے لیکن راتیں گزارنے کے لئے مجھے اپنے والد صاحب سے اجازت حاصل کرنی پڑے گی۔“

وہ بیساختہ ہنس پڑا اور اس کی حالت مضحکہ خیز تھی۔ کبھی وہ باجھیں پھاڑ لیتا تھا اور کبھی ہونٹ سکڑ لیتا تھا۔ بدقت تمام وہ خاموش ہوا اور بولا۔ ”آپ اسے پھانس لینے میں کامیاب ہو جائیں گے.... مجھے یقین ہے۔“

”لیکن میں اسے پھانس کر کروں گا کیا۔ کہیں اتنا بڑا فرینک پین بھی نہیں ملے گا کہ اسی میں ڈال کر تل ڈالوں۔“

”بس....!“ وہ منہ پر دونوں ہاتھ رکھتا ہوا بولا ”اب نہ ہنسیے! میرے لئے بہت مشکل ہے

کہ میں باجھیں پھاڑ کر ہنسوں.... بہت مشکل۔“

”مائی ڈیر.... مسٹر چانگ اتنا معلوم کئے بغیر تو میں ہر گز نہ رہوں گا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔“

”مقصد....!“ چانگ سنجیدہ ہو گیا۔ وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اُس نے کہا۔ ”میں

صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ اس لڑکی کی پشت پر کون ہے۔ میں پولینڈ سے اس کا تعاقب کرتا آیا ہوں۔“

پولینڈ سے۔“

”ہاں کیپٹن.... اور یہ معلوم کرنا بہت ضروری ہے کہ حقیقتاً اس کی پشت پر کون ہے۔“

”کیا آپ کو شبہ ہے کہ اس کی پشت پر کوہان ہو گا۔“

اس نے ہنسنا چاہا۔ مگر پھر رک گیا۔ وہ آہستہ آہستہ کہہ رہا تھا۔ ”وہ ایک پراسرار لڑکی ہے

کیپٹن.... انتہائی پراسرار.... اوہ میرے خدا.... وہ دیکھو.... اُدھر.... دائیں جانب جہاں ایک

لڑکی کے سر پر گلاب کے پھول نظر آ رہے ہیں وہ آدمی اُسے کس طرح گھور رہا ہے۔ وہ روزانہ اسے

اسی طرح گھورتا ہے۔ میں کئی دنوں سے دیکھ رہا ہوں اور وہ اسی میز پر ہمیشہ بیٹھا ہے۔“

میں نے اس کی بتائی ہوئی سمت میں دیکھا۔ حقیقتاً ایک آدمی اسے گھور رہا تھا۔ مگر یہ بکواس

تھی وہاں تو سبھی اسے گھور رہے تھے۔ حتیٰ کہ عورتیں بھی.... شاید وہ اس کے مقابلے میں خود کو کمتر محسوس کر رہی تھیں۔

”اب یہ یہاں کھانا کھا کر ہائی سرکل ٹائٹ کلب جائے گی۔“ چانگ نے کہا۔ ”اور یہ آدمی اس

کا تعاقب کرے گا۔“

”اچھا....!“

ہم کھانا ختم کر چکے تھے۔ چانگ نیپکن سے ہاتھ صاف کر رہا تھا۔ اتنے میں وہ لڑکی اپنی جگہ

سے اٹھی اُس کے باڈی گاڑ بھی اٹھے۔ وہ ریکریشن ہال کی طرف جا رہی تھی۔

”اس نے کھانا تو نہیں کھایا۔“ میں نے کہا۔

”پتہ نہیں۔“ چانگ سر ہلا کر رہ گیا۔ اس کی نگاہ برابر لڑکی کا تعاقب کرتی رہی۔

”مگر اس کا نام کیا ہے.... مسٹر چانگ۔“

”نام....!“ چانگ نے ایک طویل سانس لی۔ ”پولینڈ میں اس کا نام اینا پاولووا تھا۔ بلجیم میں



بر تھا واکین۔ فرانس میں تانیا نورا... انگلینڈ میں گریٹا سوئٹزن اور یہاں اس کا نام ہے سوفیادی گارہم۔“

”بس... قبر کے لئے بھی کچھ چھوڑیے...“ میں نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”اس کی پشت پر کون ہے۔“ چانگ کچھ سوچتا ہوا بڑبڑایا۔ ”اس کٹھ پتلی کی ڈور کس کے ہاتھ

میں ہے۔“

”آپ نے بہت دیر سے انیون نہیں پی مسٹر چانگ۔“

”اوہ... ہاں ابھی ہم لاؤنج میں چلیں گے۔ مگر نیپٹن اب میرا خیال ہے کہ آپ اپنا کام کیجئے۔ میں واپس جاؤں گا۔ آپ کی واپسی بھی اسی عمارت میں ہوگی جہاں میں مقیم ہوں۔ کرئل نے کہا ہے کہ میں جتنے دن چاہوں آپ کو اپنے ساتھ رکھ سکتا ہوں۔“

”آپ جاسکتے ہیں مسٹر چانگ۔ میں سب کچھ دیکھ لوں گا۔“ میں نے کہا۔ حقیقتاً میں چانگ سے اتنا گیا تھا۔ وہ مجھے بالکل ڈفر معلوم ہوتا تھا۔

”شکریہ کیپٹن۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”مجھے توقع نہیں تھی کہ آپ اتنی آسانی سے پیچھا چھوڑ دیں گے۔ میں دراصل اس وقت اس داستان کے دہرانے کے موڈ میں نہیں ہوں۔ دیے کرئل کو سب کچھ معلوم ہے۔“

”میں کچھ بھی معلوم کرنا نہیں چاہتا۔ سوائے اس کے کہ وہ لڑکی کیسا ناچتی ہے۔“ میں نے کہا۔ چانگ نے میرا یہ جملہ اپنا منہ دبا کر بہت پسند کیا۔ اگر فوراً ہی اٹھ نہ گیا ہو تا تو میرے کانوں کو ایک بار پھر اس کی ”ہو ہو“ ہضم کرنی پڑتی۔

اس کے جاتے ہی میں نے ریکر نیشن ہال کی راہ لی۔ یہاں حسب معمول رونق ہی رونق تھی۔ یعنی بے شمار لڑکیاں نظر آرہی تھیں۔ میری نظریں اسے تلاش کر رہی تھیں... اُف... فوہ... وہ ایک ایسی لڑکی تھی جس سے عشق کرنے کی اجازت فادر ہارڈ اسٹون سے بھی مل چکی تھی۔ آرکسٹرا موسیقی بکھیر رہا تھا۔ لیکن ابھی رقص شروع نہیں ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ آخر اسے ہم رقص بنانے کیلئے کونسا راستہ اختیار کیا جائے، اس کے طلب گار تو سیکڑوں رہے ہوں گے۔ کئی منٹ تک ذہن پر زور دیتا رہا لیکن کوئی تدبیر سمجھ میں نہ آئی۔ ویسے وہ لڑکی تو نظر آگئی تھی اور یہاں بھی وہ اپنی میز پر تنہا نظر آرہی تھی اور اس کے پیچھے کی میز پر اس کے باڈی گارڈ

بیٹھے ہوئے تھے۔ جن کی جیبوں میں یقینی طور پر پستول رہے ہوں گے۔ میں نے آؤ بھی دیکھا اور تاؤ بھی دیکھا لیکن سیدھا اس کی میز کی طرف چلا گیا اور اتنے اطمینان سے کرسی کھسکا کر بیٹھ گیا جیسے بہت پرانی بے تکلفی ہو۔ ایک بیک میں نے اس کی آنکھوں میں غصے اور حیرت کے آثار دیکھے۔ اس کے باڈی گارڈ بھی جیبوں میں ہاتھ ڈال کر کھڑے ہو گئے تھے۔

میں نے بڑی تیزی سے اپنے چہرے پر بیچارگی اور حماقت کے آثار پیدا کئے اور کپکپاتی ہوئی آواز میں آہستہ سے بولا۔ ”معاف فرمائیے گا معاف فرمائیے گا... میں اس وقت خطرے میں ہوں۔“

”کیوں؟“ وہ مجھے گھورتی ہوئی بولی اور پلٹ کر باڈی گارڈ کو بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔

”میری منگیت نے مجھے یہاں دیکھ لیا ہے۔ اگر میں تمہارا تو مجھے اس کے ساتھ ناچنا پڑے گا۔“ میں نہیں سمجھی۔ ”اس کی آواز میں بھی بلا کی سکس اپیل تھی۔“

”اوہ... میں کیسے سمجھاؤں۔“

”منگیت سے بھاگتے ہو۔“ اس نے حیرت سے کہا۔

”ہاں...!“

”یہ بات تھی تو منگیت بنایا ہی کیوں تھا۔“

”یہی تو یوروپین سمجھتے نہیں۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”ہمارے یہاں کے رسم و رواج تمہارے معاشرے کے رسم و رواج سے بالکل مختلف ہیں۔ ہمارے یہاں لڑکی یا لڑکے کا انتخاب والدین کرتے ہیں۔“

”اوہ... ہاں... میں جانتی ہوں۔“

”مجھے وہ لڑکی بالکل پسند نہیں ہے۔“

”پھر میں کیا کروں؟“

”بس تھوڑی دیر مجھے یہاں بیٹھنے دیجئے۔ آپ کے پاس مجھے دیکھ کر وہ کبھی ادھر کا رخ نہ کرے گی۔“

”اور دل ہی دل میں مجھے گالیاں دے گی... کیوں؟“ وہ مسکرائی۔ اور کسی قدیم ناول نویس کے قول کے مطابق میرے خرمن ہوش و حواس پر بجلیاں سی گزادیں۔ حقیقتاً اس کی مسکراہٹ بڑی دلکش تھی۔

”کچھ بھی ہو مجھے یہاں تھوڑی دیر بیٹھنے دیجئے۔“

”خصوصیت سے یہیں کیوں؟“ وہ میری آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔ ”یہاں کئی میزوں پر تنہا لڑکیاں نظر آرہی ہیں۔“

”لیکن سب سے پہلے آپ ہی نظر آئی تھیں اور پھر یہ دہی لڑکیاں بڑی تنگ نظر ہوتی ہیں۔ میں ان سے بات کرنا بھی پسند نہیں کرتا۔ اس وقت اگر آپ کی جگہ کوئی دہی لڑکی ہوتی تو میری شامت آگئی ہوتی۔ وہ طوفان بد تمیزی پھیلتا کہ خدا کی پناہ۔“

”جی بات۔“ وہ وارنگ دینے کے انداز میں انگلی اٹھا کر بولی۔ ”انتا سلیقہ مجھے بھی ہے کہ میں جھوٹ اور سچ میں امتیاز کر سکوں اور اب تم اسی صورت میں صحیح و سلامت اس کرسی سے اٹھ سکو گے جب جی بات بتاؤ۔ میری باڈی گارڈ بہت زیادہ شریف نہیں ہیں۔“

یک بیک میں نے اپنے چہرے پر شدید ترین غصے کے آثار پیدا کئے نچلا ہونٹ دانتوں میں دبائے اُسے گھورتا رہا پھر بولا۔ ”لڑکی ہوش میں آؤ۔ تم میری توہین کر رہی ہو۔ کیا تم نہیں جانتیں کہ میں کون ہوں۔ میری رگوں میں شاہی نسل کا خون دوڑ رہا ہے اور لوگ مجھے پرنس داراب کہتے ہیں۔ یہاں کس میں ہمت ہے کہ مجھ سے آنکھ ملا سکے۔ پچھلے سال میں نے فرانس میں تین ڈویئل لڑے تھے۔ میں اپنے باپ مہاراجہ سرخاب کے علاوہ اور کسی سے نہیں ڈرتا۔ میری مگنیتر جس سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہوں وہ بھی کوئی معمولی لڑکی نہیں۔ ریاست چڑیا پور کی شہزادی ہے۔“

مجھے غصے میں دیکھ کر اس کے باڈی گارڈز پھر کھڑے ہو گئے۔ لیکن اس نے مڑ کر انہیں بیٹھ جانے کا اشارہ کیا۔ پھر مسکرا کر بولی۔ ”معاف کیجئے گا شہزادے صاحب مگر تعارف حاصل کرنے کا یہ ایک گھٹیا سا طریقہ ہے۔“

”تم برابر میری توہین کئے جا رہی ہو۔ میں تم پر لعنت بھیجتا ہوں۔“ میں نے کہا اور اٹھ گیا۔ ”بیٹھو بیٹھو! ورنہ سچ سچ یہاں خون کی ندیاں بہہ جائیں گی۔ میرے باڈی گارڈز کو شبہ ہو گیا ہے کہ تم بڑے دشمنوں سے تعلق رکھتے ہو۔ یہ میری ایک نہ سنیں گے کیونکہ یہ کسی دوسرے کو جوابدہ ہیں۔ ٹھہرو میں نے تمہاری توہین نہیں کی۔۔۔ تم مجھے بے حد دلچسپ آدمی معلوم ہوئے ہو۔ کیونکہ آج تک مجھ سے کسی نے بھی ایسے لہجے میں گفتگو نہیں کی جس لہجے میں تم کر رہے ہو۔“

میں بیٹھ گیا۔ لیکن اپنے چہرے پر جھلاہٹ کے آثار باقی رکھے اور بولا۔ ”تم لڑکیوں میں بہ

بہت بڑی کمزوری ہوتی ہے کہ خواہ مخواہ ہر ایک کو فلرٹ سمجھنے لگتی ہو۔ میں تم سے رقص کی درخواست نہیں کروں گا۔ حالانکہ یہاں نہ جانے کتنے اس کے خواہش مند ہوں گے۔ میں صرف اتنی ہی دیر اس میز پر بیٹھنا چاہتا ہوں جتنی دیر وہ یہاں موجود ہے۔“

”وہ کہاں ہے۔۔۔۔ مجھے بھی دکھاؤ۔“

”آج۔۔۔۔ چھا۔۔۔۔!“ میں نے کہا۔ مگر یہ مسئلہ ٹیڑھا تھا۔ حالانکہ دور ہی سے دکھانا تھا جو کسی طرح بھی خطرناک نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر سوال تھا کسی ایسی لڑکی کا جو شہزادوں کی سی شان رکھتی ہو۔ جلد ہی مشکل آسان ہو گئی۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں کہ اسے وہاں پیشتر عورتیں اور لڑکیاں بھی گھور رہی تھیں۔ انہیں میں ایک گنبد نما لڑکی نظر آگئی۔ شاید آپ ”گنبد نما“ پر چونک پڑیں۔ مطمئن رہئے وہ لڑکی ہی تھی۔ کوئی مقبرہ نہیں۔ میں نے اسے گنبد نما اس لئے کہا ہے کہ اس نے اپنے بال اوپر سمیٹ کر جوڑا لگایا تھا اور جوڑے کے گرد چنبیلی کے پھولوں کا ایک ہار لپٹا ہوا تھا اور جوڑے کے اوپر ایک بڑا سا گلاب نظر آرہا تھا۔ لباس اس کا یوریشین تھا۔ یعنی پیٹ اور کمر کھلے ہوئے تھے۔ مگر پتہ نہیں اس نے لنگوٹی پر ساری کو کیوں ترجیح دی تھی۔ وہ اسے گھور رہی تھی۔

”وہ دیکھو وہ رہی۔۔۔۔!“ میں نے اس سے کہا۔

پھر جیسے ہی دونوں کی نظریں ملیں گنبد نما لڑکی میری طرف دیکھنے لگی۔ چلنے قصہ تمام ہوا۔

”اوہ۔۔۔۔ وہ کافی خوبصورت ہے۔“ اس نے میری طرف دیکھ کر کہا۔

”مگر مجھے تو پرستان کی بھینس معلوم ہوتی ہے۔“ میں نے جھنجھلا کر کہا اور وہ ہنسنے لگی۔ اب میں اس ہنسی کی کیفیت کیا بیان کروں۔ اتنی دیر تک چانگ کی ہنسی سنتے سنتے کان پک گئے تھے بہر حال انہیں پکے ہوئے کانوں میں اس تقریقی ہنسی کی آواز گویا امرت کی پچکاری معلوم ہوئی اور شہزادہ داراب ولد مہاراجہ سرخاب سجدہ شکر بجالانے کا ارادہ کرنے لگا۔ مگر ارادہ پورا نہ ہوا کیونکہ اس لڑکی نے اس کا موقع ہی نہ دیا۔ وہ اب بڑی تیزی سے میرا دماغ چاٹ رہی تھی۔

”تم بہت بد ذوق آدمی معلوم ہوتے ہو۔“ وہ کہہ رہی تھی۔ ”اس نے کتنے حیرت انگیز طور پر اپنے بال سجائے ہیں۔ اگر یہ پیرس میں ہوتی تو ہزاروں اس کے لئے جانیں دینے پر تیار ہو جاتے۔“

”تو پھر عقرب میں اسے پیرس بھجوانے کا انتظام کروں گا اور خود بھی وہیں جا کر کفن و دفن

کشیڈنی افیون کی بدبو یاد آئی اور کانوں میں پی جاگ کی ”ہو ہو“ گونجنے لگی۔ پھر یاد آیا کہ شاید بعض اوقات خواب میں بھی یہ ”ہو ہو“ پریشان کرتی رہی تھی۔

میں نے پھر آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن اب نیند کہاں تھی۔ خواب کی خوشبوئیں ذہن میں چکرانے لگی تھیں اور کبھی افیون کے دھوئیں کی بوا نہیں چھوٹی ہوئی ذہن کی لامحدود گہرائیوں میں کم ہو جاتی۔

دفعۃً دروازہ کھلا اور چاگ کا خطا الحواس بوڑھا ملازم ہاتھوں پر ایک چھوٹی سی کشتی اٹھائے ہوئے اندر داخل ہوا۔ میں اٹھ بیٹھا۔ وہ قریب آ گیا۔ کشتی میں چاندی کی ایک چھوٹی سی کنوری رکھی ہوئی تھی جس میں سیاہ رنگ کی کوئی سیال شے تھی۔

”یہ کیا ہے...!“ میں نے پوچھا۔

”افیون جناب...!“ نہایت ادب سے جواب دیا گیا۔

مجھے اس کی اس سادگی پر تاؤ آ گیا۔ میں پچھلے ہی دن سے بتا چکا تھا کہ میں افیونی نہیں ہوں۔

”اسے ادھر رکھ دو۔“ میں نے میز کی طرف اشارہ کیا اور خود مسمری سے اتر آیا۔

پھر وہ افیون رکھ کر سیدھا بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ میں نے اُسے اٹھا کر بیچ دیا۔ وہ کسی پاگل کتے کی طرح چیخنے لگا۔ دوسرے ہی لمحے میں اس کے سینے پر سوار تھا۔ اس کے کھلے ہوئے منہ میں نے کنوری کی افیون انڈیل دی اور اس کے حلق سے خرخرہٹ بلند ہونے لگی۔

چاگ بڑی بدحواسی کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا اور حیرت سے آنکھیں پھاڑے ہمیں دیکھتا رہا۔ جب ساری افیون بوڑھے کے حلق سے اتر گئی تو میں نے اُسے چھوڑ دیا۔

چاگ سوالیہ انداز میں مجھے گھور رہا تھا۔

”میں اسے افیون پلا رہا تھا۔“ میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

چاگ نے اس کنوری اور کشتی کی طرف دیکھا اور ملازم پر برس پڑا۔ پتہ نہیں وہ کیا بک رہا تھا۔ تھوڑی دیر تک دونوں ”چوں چوں چاں چاں“ کرتے رہے اور پھر بوڑھا ملازم میرا شکریہ ادا کر کے چلا گیا۔

”آپ نے بہت بُرا کیا کیپٹن۔“ چاگ بولا۔

”میں نے کل ہی اس گدھے کو بتا دیا تھا کہ میں افیون استعمال نہیں کرتا۔“

کرنے والی ایک فرم قائم کروں گا جس کے سائن بورڈ پر تحریر ہوگا شہزادی دردانہ پر جان دینے والے ہم سے چھبڑ و تکلفین کرائیں۔ ہم انہیں ان کے شایان شان دفن کر سکیں گے۔“

وہ ہنسنے لگی۔ کافی دیر تک ہنستی رہی پھر بولی۔ ”تم بہت دلچسپ آدمی ہو۔“

میں اس کا اعتراف کرنے ہی والا تھا کہ رقص کے لئے موسیقی شروع ہو گئی۔ لوگ اٹھنے لگے اور گنبد نما لڑکی بھی اپنے ایک ساتھی کے ساتھ چوبی فرش پر اتر گئی۔

”بس... بہت بہت... شکریہ۔“ میں اس انداز میں اٹھا جیسے سر پر پیر رکھ کر بھاگ لوں گا۔

”اوہ... ٹھہرو...!“ اس نے میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ”ہم ناچیں گے۔“

”نہیں... اس وقت نہیں... پھر کبھی۔“

”ابھی اور اسی وقت۔“

تھوڑی سی رد و قدح کے بعد میں ناچنے پر تیار ہو گیا اور ہم بھی رقصوں کی بھیڑ میں آ گئے۔

پہلے ہی راؤنڈ میں وہ مجھ سے کافی بے تکلف ہو گئی۔ ہم متواتر تین راؤنڈ ناچے پی چاگ کا خیال بالکل صحیح تھا وہ شاید ہنسنے ہنسانے والوں کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھی جب ہم بہت زیادہ تھک گئے تو دوسرے دن ملنے کے وعدے پر ہم نے ایک دوسرے کو الوداع کہی۔

میں اس عمارت میں واپس آیا جہاں چاگ مقیم تھا۔ ابھی گھنٹی کا بزن دبا ہی رہا تھا کہ کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا اور ساتھ ہی چاگ کی ”ہو ہو“ بھی سنائی دی۔ پھر وہ بیتابانہ انداز میں بولا۔ ”اوہ کیپٹن آپ حیرت انگیز ہیں۔ اتنی جلدی... اتنی جلدی۔ صرف چند منٹ میں اتنی بے تکلفی... آپ جادوگر ہیں۔ میں سب دیکھ رہا تھا۔“

چاگ میرے ہاتھ چومنے لگا۔ کشیڈنی افیون کی بدبو کی وجہ سے میرا دماغ پھٹا جا رہا تھا۔

## بہشتی کا چچا

صبح بستر سے اٹھنے کو دل نہیں چاہا۔ پچھلی رات تقریباً ڈھائی بجے سویا تھا اور سوتے وقت بھی اس لڑکی کے ساتھ کبھی کبھی ناچتا رہا تھا اور جب آنکھ کھلی تھی اس وقت ویسی ہی خوشگوار خوشبو محسوس ہوئی تھی جیسی پچھلی رات اس کے بالوں سے نکل رہی تھی۔ لیکن اس کے فوراً بعد ہی

”ارے آپ اسے قتل کر دیتے! مگر اب وہ سور کا بچہ ہر دوسرے گھنٹے پر یہ بھول جائے گا کہ آپ افیون استعمال نہیں کرتے اور میری نہایت نفیس قسم کی افیون اس حرام زادے کے ناپاک حلق سے اترتی رہے گی۔“

مجھے ہنسی آگئی اور چانگ بولا۔ ”کبھی نہیں اسے ہمیشہ پہلے دو جوتے لگائے پھر بات کیجئے۔ اس کا دماغ بالکل درست رہے گا اور وہ کوئی بات نہ بھولے گا۔“

میں نے اس کے مشورے پر عمل کرنے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ میرے جوتے انشورڈ نہیں تھے۔ ”خیر....“ چانگ سر ہلا کر بولا۔ ”میں دراصل اس لئے آیا تھا کہ آپ کو آپ کے کارنامے کا نتیجہ سنا دوں۔“

”کون سا کارنامہ۔“

”پچھلی رات کا کارنامہ۔“ چانگ ایک لمبی سانس لے کر بولا۔ ”آپ کی نگرانی شروع ہو گئی ہے۔ میرا خیال ہے کہ پچھلی رات ہی کو آپ کا تعاقب کیا گیا تھا۔“

”کیوں؟“

”صبح سے ایک آدمی عمارت کے سامنے موجود ہے اور مجھے یقین ہے کہ وہ اسی لڑکی کے آدمیوں میں سے ہے۔“

”اوہ.... تو کیا اس لڑکی کو مجھ پر شبہ ہو گیا ہو گا۔“

”ضروری نہیں ہے۔ لیکن اس آدمی کو ضرور شبہ ہو سکتا ہے جو اس کی پشت پناہی کر رہا ہے۔“ چانگ نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”آہ.... تب تو اس بیچاری کا کوئی قصور نہیں۔ وہ انتہائی شریف اور نیک لڑکی معلوم ہوتی ہے۔“

چانگ اس پر اس طرح چوکا جیسے میں نے اسے کوئی گندی سی گالی دی ہو۔

”اس خیال کو دل سے نکال دیجئے کیپٹن۔“ چانگ نے مغموں لہجے میں کہا۔ ”ورنہ یہ بیچارہ چانگ دوہرا پیٹ رکھنے کے باوجود بھی جہنم میں پہنچ جائے گا۔ کیا آپ سچ سچ اس کے عشق میں مبتلا ہو گئے ہیں۔“

میں نے بے بسی سے سر ہلا دیا۔ چانگ نے بھی ایک لمبی سانس لی اس کے چہرے سے ایسا

معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی ابھی اپنے اکلوتے بیٹے کو دفن کر کے آیا ہو۔ میں بھی اس طرح خاموش ہو گیا جیسے میں اس سلسلے میں اس کی کوئی بات نہ سننا چاہتا ہوں۔ کچھ دیر بعد اس نے کہا۔ ”مجھے کرئل نے یقین دلایا تھا کہ آپ کو سچ سچ کسی سے عشق نہیں ہو سکتا۔ آپ صرف اسے بیوقوف بنائیں گے۔“

”مسٹر چانگ مجھے افسوس ہے کہ میں اس لڑکی کو بیوقوف نہیں بنا سکوں گا۔“

”تب تو میں ڈوب گیا۔“ چانگ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”کیا یہ ممکن نہیں ہے مسٹر چانگ کہ میں اس آدمی کو جو اس کی پشت پر ہے آپ کے حوالے کر کے اس سے شادی کر لوں۔“

”نہیں.... میں اسے بھی قابو میں کرنا چاہتا ہوں۔ آخر آپ اسے کیا سمجھتے ہیں۔“

”اوہ اُسے۔“ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور آہستہ سے بولا۔ ”میں اسے سفید افیون سمجھتا ہوں مسٹر چانگ.... مگر افسوس نہ تو میں اسے پائپ میں رکھ کر پی سکتا ہوں اور نہ گھول کر پی سکتا ہوں میں کیا کروں میری سمجھ میں نہیں آتا۔“

”اچھا.... اچھا....!“ چانگ غمگین آواز میں بولا۔ ”آپ اس سے شادی کر لیجئے گا مگر مجھے معلوم ہونا چاہئے کہ وہ کون آدمی ہے جو اس کی پشت پناہی کر رہا ہے۔“

”شکریہ.... مسٹر چانگ.... یہ آپ کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا۔“ میں نے کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ میں اس عمارت میں پرنس داراب کی نیم پلیٹ لگوادوں۔“

”یہ بہت اچھا خیال ہے۔ میں نے بھی یہی سوچا تھا۔ اب یہ ضروری ہے کہ میں یہاں سے کہیں اور چلا جاؤں۔ کیونکہ اس نے مکان کی نگرانی شروع کرادی ہے۔“

”مجھے اس کی ”ہو ہو“ یاد آگئی اور میں نے خلوص نیت سے اس کے اس خیال کی تائید کرتے ہوئے کہا۔ آپ اپنے آدمیوں کو بھی لے جائیے۔ ملازموں کا انتظام میں کر لوں گا۔

وہ اس تجویز پر بے حد خوش ہوا اور مجھے اس بات پر بے حد خوشی ہوئی کہ اس نے اپنی خوشی کا اظہار ”ہو ہو“ کر کے نہیں کیا۔

شام تک وہ اپنے آدمیوں سمیت وہاں سے چلا گیا۔ لیکن جب وہ وہاں سے جا رہا تھا کوئی بھی ایسا آدمی نہیں نظر آیا جس پر مکان کی نگرانی کرنے کا شبہ کیا جاسکتا۔



اس کے بعد میں نے اپنے تین ماتحتوں کو وہاں طلب کر لیا اور پھانک پر پرنس داراب کے نام کی تختی لگا دی گئی۔ کرنل نے اپنی لنگن بھی مجھے ہی بھجوا دی تھی۔ انہوں نے بھی اس رائے سے اتفاق کیا تھا کہ چانگ وہاں سے چلا جائے۔ لیکن انہوں نے مجھے اب بھی کچھ نہ بتایا۔ ویسے مجھے یقین تھا کہ چانگ نے انہیں سارے حالات سے آگاہ کیا ہو گا۔ مگر کرنل کا مقولہ تھا کہ اگر آدمی کا دائرہ معلومات اس کی قوت عمل سے زیادہ ہو تو وہ اپنا جہاز ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس صورت میں وہ باتیں تو بڑی لمبی چوڑی کرتا ہے لیکن عملی اعتبار سے صفر ہی رہتا ہے۔ میں نے کرنل کو پچھلی رات کے واقعات سے بھی مطلع کر دیا تھا اور ان سے مجھے ہدایت ملی تھی کہ میں اپنی ملاقاتیں جاری رکھوں۔

ہاں شاید میں نے ابھی تک اس کا تذکرہ نہیں کیا کہ میں بھی میک اپ میں تھا۔ چانگ کے ساتھ روانہ کرنے سے قبل کرنل نے میرے چہرے کی تھوڑی سی مرمت کی تھی۔

رات کو میں پھر ہوٹل ڈی فرانس میں تھا۔ لیکن گیارہ بجے تک وہ نہیں آئی۔ میں ریکریشن ہال کی اسی میز پر اس کا انتظار کرتا رہا جس پر ہم دونوں پچھلی رات تھے۔ رقص کے دوران میں اچانک اعلان کرنے والے مائیک سے آواز آئی۔

”پرنس داراب پلزز۔۔۔ جناب والا۔۔۔ آپ کی کال ہے۔ منیجر کے کمرے میں تشریف لائیے۔“

میں اٹھ کر منیجر کے کمرے کی طرف روانہ ہو گیا۔ وہاں میں نے جس سے فون پر بات کی وہ سوفیا ہی تھی۔ اس نے مجھے بتایا کہ وہ بعض وجوہ کی بناء پر ہوٹل دی فرانس نہیں آسکی لیکن اب وہ ہائی سرکل ٹائٹ کلب میں میرا انتظار کر رہی ہے۔

میں باہر آیا۔۔۔ اور لنگن میں بیٹھ کر ہائی سرکل کلب کی طرف روانہ ہو گیا۔

مجھے یقین ہے کہ میرا تعاقب کیا جا رہا تھا۔ اب پتہ نہیں تعاقب کرنے والا چانگ تھا یا اور کوئی۔ تعاقب کا یقین اس وقت ہو گیا جب میں نے اپنی گاڑی غیر ضروری طور پر ادھر ادھر کی گلیوں اور سڑکوں پر بھٹکانی شروع کر دی کیونکہ پیچھے لگی ہوئی کار ایک بار بھی کسی دوسرے راستے پر نہیں مڑی۔ بس اس نے مجھے کلب تک پہنچا کر ہی دم لیا۔ جب میری گاڑی کلب کی کمپوٹ میں داخل ہو رہی تھی پچھلی کار فرارے بھرتی ہوئی آگے چلی گئی۔

سوفیا ڈاننگ ہال میں موجود تھی۔ مجھے دیکھ کر بڑے دل آویز انداز میں مسکرائی آج بھی دونوں گارڈ اسکے ساتھ تھے۔ میں نے محسوس کیا وہ کینہ تو ز نظروں سے میری طرف دیکھ رہے ہیں۔

میں سیدھا اس کی میز کی طرف بڑھتا چلا گیا۔

”ہلو پرنس۔۔۔!“ اس نے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

میں نے اپنا ہاتھ ڈھیلا چھوڑ دیا۔ کیونکہ میں کسی قسم کی گرم جوشی ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”یہ بڑا غلط طریقہ تھا۔“ میں نے غصیلے لہجے میں کہا۔

”کیسا طریقہ میں نہیں سمجھی۔۔۔ بیٹھو۔۔۔!“

”اس طرح فون کرنے کی کیا ضرورت تھی اگر آج ہم نہ ملتے تو دنیا کے جغرافیہ میں کون سی

تبدیلی واقع ہو جاتی۔“

”اوہ کیا تم نہیں آنا چاہتے تھے۔“

”آنا چاہتا تھا لیکن میں اسے پسند نہیں کرتا کہ کسی پبلک مقام پر میرا نام مانگیجے و فون پر

لیا جائے۔“

”کیوں۔۔۔!“

”تم خود سوچو! کتنی بدنامی کی بات ہے۔۔۔ پرنس داراب اور ہوٹل ڈی فرانس جیسا گھٹیا

ہوٹل۔۔۔!“

”اوہ۔۔۔ مگر وہ تو ایک شاندار ہوٹل ہے۔“

”میری نظروں میں نہیں ہے۔“

”ختم کرو۔ میں آج دن بھر تمہارے متعلق سوچتی رہی۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ہم

پہلے بھی کہیں ملے ہوں۔“

”ہو سکتا ہے“ میں نے لاپرواہی سے کہا اور دوسری طرف دیکھنے لگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ

حقیقت بیان کر رہی ہے یا چانگ کے خیال کے مطابق اسے مجھ پر کسی قسم کا شبہ ہو گیا ہے یا پھر وہ

اسی آدمی کی ہدایت پر مجھ سے قریب ہونے کی کوشش کر رہی ہے جو چانگ کے بیان کے مطابق

اس کی پشت پناہی کر رہا ہے۔ وہ خود کتنی بھولی اور بے ضرر معلوم ہوتی ہے بعض اوقات تو چانگ

کے اندیشوں کا مضحکہ اڑانے کو دل چاہتا تھا۔

”تم کون ہو۔“ میں نے اس سے پوچھا۔ ”کہاں سے آئی ہو۔۔۔ کیا مجھے اپنے متعلق کچھ نہ

بتاؤ گی۔“



کیا تھا۔ یہ تو صرف میں جانتا تھا کہ ان کا مقصد یہ ہے کہ میں اُس طرف آؤں۔

”اوہ.... میں ذرا ہاتھ روم تک جاؤں گا۔ ابھی آیا۔“ میں نے سوفیا سے کہا اور اٹھ گیا۔ میری رفتار بھی کچھ ایسی ہی تھی جیسے اگر میں نے ہاتھ روم تک پہنچنے میں جلدی نہ کی تو کوئی حادثہ ہو جائے گا۔

اس حصے میں سنا تھا کرئل نے مجھے ہلکی سی سیٹی سے اپنی طرف متوجہ کیا وہ دیوار سے لگے کھڑے تھے۔

”میں صرف یہ کہنا چاہتا تھا کہ اگر وہ تمہیں کہیں لے جانا چاہے تو بے خوف چلے جانا۔“ انہوں نے کہا۔

”بس اتنی سی بات کے لئے....!“ میں نے برا سامنہ بنایا۔

”میں نے سوچا تم حالات مد نظر رکھتے ہوئے اسے ٹالنے کی کوشش نہ کرو۔“

”حالات والات آپ کے ساتھ ہوتے ہوں گے۔ میں تو ایک ٹانگ پر اچھلتا ہوا جاتا موت صرف ایک بار آتی ہے.... اور خوبصورت لڑکیاں بار بار ملتی ہیں۔ لہذا میں ایک بار والے معاملے کی بالکل پرواہ نہیں کرتا۔“

کرئل اس انداز میں مسکرائے جیسے زندگی میں پہلی بار میری کوئی بات پسند آئی ہو۔

”دفع ہو جاؤ۔“ انہوں نے کہا اور عقبی دروازے کی طرف مڑ گئے۔

میں ہال میں واپس آ گیا۔ سوفیا مجھے دیکھ کر مسکرائی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ بہت بے چینی سے میرا انتظار کرتی رہی ہو۔

میں خوش ہو گیا خوشی کی بات بھی تھی۔ اگر آپ یہ محسوس کر لیں کہ کوئی لڑکی آپ کا انتظار بھی کر سکتی ہے تو آپ کا کیا حال ہو گا۔ اس کی پرواہ نہیں کہ وہ لڑکی بھینس کی نواسی ہے یا گینڈے کی بھتیجی۔

میں بیٹھ گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک میرے چہرے کا جائزہ لیتی رہی پھر بولی۔ ”کیا پیو گے۔“

”کچھ بھی نہیں۔“

”وہ سکی سوڈا یا اور کچھ۔“

”میں شراب نہیں پیتا۔“

”میں بھی پسند نہیں کرتی کہ لوگ مجھے پہچانیں۔“

”کیوں....؟“ میں اسے گھورنے لگا۔ کیا وہ مجھے اپنی اصلیت بتانے جا رہی تھی؟

”میں فرانس کے ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتی ہوں جو بہت معزز ہے۔“

”تو کیا میں گدھوں کے خاندان سے تعلق رکھتا ہوں۔“ میں نے بھلاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

”شاید....!“ وہ میری آنکھوں میں دیکھتی ہوئی مسکرائی۔ ”تم نے ابھی تک تو اپنے آدمی ہونے کا ثبوت دیا نہیں۔“

”اگر میں یہ میز الٹ دوں تو تم کہاں ہو گی۔“ میں نے دانت پیس کر کہا۔

”جہاں بھی ہوں گی وہاں تم بھی پہنچ جاؤ گے۔ میرے باڈی گارڈز یہاں موجود ہیں۔“

”ان دونوں کو بیک وقت چیلنج کر سکتا ہوں۔“

”کیوں؟ کیا وہاں تمہیں کل تو تم اچھے خاصے تھے۔“

”تو آج ہی کوناشیو بڑھا ہوا ہے۔ میرا خیال ہے کہ میں آج بھی اچھا لگ رہا ہوں گا۔“

”کیا تم کریک ہو.... میں تمہیں ابھی تک نہیں سمجھ سکی۔“

”لڑکیوں کے بس کا روگ نہیں ہوں۔ پچاسی سال کی بوڑھیاں بھی مجھے سمجھنے سے قاصر

رہتی ہیں۔ تم خود ہو گی کریک۔“

”پھر بھی تم مجھے دلچسپ معلوم ہوتے ہو۔“ وہ ہنسنے لگی اور نہ جانے کیوں مجھے چانگ کی ہنسی یاد آ گئی۔

میرے خداداد کس بُری طرح میرے ذہن سے چپک کر رہ گئی تھی۔ بعض اوقات تو مجھے ایسا محسوس ہونے لگتا جیسے میں بھی کسی موقع پر غیر شعوری طور پر اسی طرح ”ہو ہو“ کر سکتا ہوں۔ میں خاموش ہو گیا۔

دفعاً میری نظر اس راہداری کی طرف اٹھ گئی جس سے پیشاب خانوں کی طرف راستہ جاتا تھا۔ وہاں مجھے کرئل نظر آئے۔ جیسے ہی ہماری نظریں ملیں وہ راہداری میں مڑ گئے۔ سوفیا کی پشت اسی طرف تھی اس لئے وہ نہ دیکھ سکی۔ اگر دیکھ بھی لیتی تب بھی کوئی ایسی خاص بات نہ تھی۔ کرئل کے مخصوص قسم کے اشاروں کو سمجھنا بھی ہر ایک کے بس کی بات نہ تھی۔ انہیں اس وقت درجنوں آدمیوں نے دیکھا ہو گا لیکن کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ انہوں نے مجھے کس قسم کا اشارہ

”تم جھوٹے ہو۔“

”میں اس بے تکلفی کی اجازت ہر گز نہیں دے سکتا۔“ میں نے پھر نتھنے پھلائے اور وہ اس انداز میں ہنسنے لگی جیسے مجھے چڑا رہی ہو۔

”اے سوفیا میں بہت بُرا آدمی ہوں۔“ میں نے غصیلالہجہ برقرار رکھا۔

”تم کیا کر لو گے میرا۔“

”میں نے نفرت سے ہونٹ سگوڑ کر دوسری طرف منہ پھیر لیا۔“

لیکن وہ میرے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”خفا ہو گئے؟“

کہنے کے انداز میں اتنی لگاوت تھی کہ بے اختیار وہیں شہید ہو جانے کو دل چاہا۔ لیکن پھر اس خیال سے شہید ہو جانے کا ارادہ ترک کر دینا پڑا کہ اس قسم کی شہادت فادر ہارڈ اسٹون کو میری قبر تک میں گھس آنے پر مجبور کر دے گی۔

”میرا موڈ خراب ہو گیا ہے۔“ میں نے چڑچاہٹ کا مظاہرہ کیا۔

”تم سنو تو سہی تمہاری وجہ سے میں بہت الجھن میں پڑ گئی ہوں۔ کیا تم فرانسیسی سمجھ سکتے ہو۔“

”بول بھی سکتا ہوں۔“

”نہیں....!“ اس نے خوشی اور حیرت ظاہر کی۔

”یقین کرو کہ میں فرانسیسی بول سکتا ہوں۔“ میں نے فرانسیسی میں کہا۔

”میرے خدا.... تب تو تم میری مدد کر سکو گے۔“

”کیا مطلب....!“

”اب ہم فرانسیسی میں گفتگو کریں گے۔ کیونکہ میرے باؤی گارڈز فرانسیسی نہیں سمجھ سکتے۔“

”ہوں....!“ میں نے دلچسپی ظاہر کی۔

اس کے چہرے پر الجھن کے آثار پائے جانے لگے۔ یا تو وہ سوچ رہی تھی کہ بات کا آغاز کیسے کرے یا پھر اس ادھیڑ بن میں مبتلا تھی کہ وہ بات مجھے بتائے یا نہ بتائے۔ کچھ دیر بعد اس نے طویل سانس لی اور آہستہ سے بولی۔ ”میں نہیں سمجھ سکتی کہ میں کن حالات سے دوچار ہوں.... میرا چچا.... اوہ.... میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں یہ بات کہاں سے شروع کروں.... ٹھہرو.... پہلے تو تم بھی سوچو گے کہ میں نے یہ بات تم سے کیوں کہی۔ ابھی کل ہی تو ہماری ملاقات ہوئی

ہے مگر اس کی بھی ایک وجہ ہے۔ فرض کرو تم میرے چچا ہو۔“

”یہ فرض کرنے سے پہلے میں مر جانا زیادہ پسند کروں گا۔“ میں جلدی سے بول پڑا۔

”میری بات سنو۔“ وہ جھلا گئی اور اس جھلاہٹ میں بچکانیت کا انداز تھا۔ اس نے کہا ”مجھے

بات کرنی نہیں آتی۔ میں یہ کہہ رہی تھی کہ میرے چچا نے مجھے تم سے ملنے سے نہیں روکا۔

حالانکہ اس سے پہلے جب بھی کسی نوجوان نے میرے قریب آنے کی کوشش کی ہے تو وہ بہت خفا

ہوا ہے اور دوسری بار اس سے نہیں ملنے دیا۔ لیکن تمہیں اس نے کل بھی دیکھا تھا اور آج بھی

دیکھ رہا ہے۔ اس نے مجھ سے یہ نہیں کہا کہ تم سے نہ ملوں۔ میں نہیں سمجھ سکتی.... وہ مجھ سے

ہمیشہ دور دور رہتا ہے۔ میرے ساتھ نہیں رہتا.... مگر میں اس کی غلام سے بدتر ہوں۔“

”وہ یہاں کہاں ہے۔“

”بائیں جانب دیکھو.... وہ جس کے بال الجھے ہوئے سے ہیں۔ خبیث صورت.... خدا اس

پر عذاب نازل کرے۔“ اس نے بائیں جانب دیکھے بغیر کہا اور میں نے بھی مناسب نہیں سمجھا کہ

فوراً ہی بائیں جانب دیکھنے لگوں۔ میں سوفیا ہی کی طرف دیکھتا ہوا کرسی کی پشت سے ٹک گیا۔ جیب

سے پائپ نکال کر اس میں تمباکو بھری اور بائیں جانب جھک کر سلگانے لگا۔ اسی دوران میں نے

بائیں جانب نظر بھی دوڑائی اور آخر مجھے ایک الجھے ہوئے بالوں والا خبیث صورت غیر ملکی نظر

آئی گیا۔ اس نے غلط نہیں کہا تھا کہ وہ خبیث صورت تھا۔ اس کے جڑے بھاری تھے اور تھو تھنی

سور کی سی تھی۔

”ہاں.... وہ مجھے اچھا آدمی نہیں معلوم ہوتا۔“

”خدا اسے غرقاب کرے۔ پتہ نہیں وہ میرا چچا ہے بھی یا نہیں۔“

## خطرہ ہے

مجھے اس پر بے حد حیرت ہوئی اور میں نے حیرت ظاہر کی.... بلکہ اسے یقین دلانے کی

کوشش کرنے لگا کہ میں اس کے اس عجیب و غریب بیان کو صحیح تسلیم نہیں کر سکتا۔

”ارے تم سنو تو سہی میں ایک یتیم اور بے سہارا لڑکی ہوں۔ اس میں شبہ نہیں کہ میں

فرانس کے ایک معزز خاندان سے تعلق رکھتی ہوں لیکن اب اس خاندان میں میرے چچا کے علاوہ اور کوئی باقی نہیں بچا۔ وہ بھی ڈچ گی آنا کا باشندہ ہے۔ ڈیڑھ سال قبل وہ فرانس آیا تھا اس نے مجھے بتایا کہ وہ میرا چچا ہے۔ ویسے میں نے اپنے دور کے عزیزوں سے سنا تھا کہ میرا چچا ڈچ گی آنا میں رہتا ہے جو بچپن ہی میں گھر سے چلا گیا تھا۔ وہ مجھ سے ملنے آیا۔ لیکن میں یقین نہ کر سکی کہ وہ میرا چچا ہی ہے۔ پھر مجھے خیال آیا کہ میرے دور کے اعزہ میں ایک بہت بوڑھا آدمی زندہ ہے جس نے بچپن میں اسے یقینی طور پر دیکھا ہوگا۔ میں اپنے اس چچا کو اس کے پاس لے گئی اور وہ بوڑھا آدمی اسے بہت دیر بعد پہچان سکا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اس وقت بہت چھوٹا تھا جب اس نے اسے دیکھا تھا۔ لیکن وہ میرا چچا ہی ہے۔ مجھے اس لئے اور بھی یقین کرنا پڑا کہ میری حالت اچھی نہیں تھی۔ میں نے سوچا کہ بھلا کسی غریب لڑکی کو بھتیجی بنانے سے کیا فائدہ اور پھر وہ ایک مالدار آدمی تھا۔ اس لئے میں نے سوچا ممکن ہے وہ سچ کہہ رہا ہو۔ میں نے اسے اپنا چچا تسلیم کر لیا۔ اس نے یورپ کی سیاحت کا پروگرام بنایا تھا۔ مجھ سے خواہش ظاہر کی کہ میں بھی اس کا ساتھ دوں۔ میں ساتھ ہو گئی۔ مفت کی سیاحت تھی اور ایک مالدار چچا۔ لیکن فرانس سے باہر نکلتے ہی وہ عجیب و غریب ثابت ہونے لگا۔ میرے لئے دو باڈی گارڈ مقرر کر دیئے اور جس ہوٹل میں مجھے ٹھہراتا تھا وہاں خود نہیں قیام کرتا تھا۔ کسی دوسرے ہوٹل میں اس کا قیام ہوا کرتا تھا۔ مجھ پر کسی قسم کی پابندی نہیں تھی سوائے اس کے کہ اگر اسے کہیں باہر دیکھ لوں تو اس سے مخاطب ہونے کی کوشش نہ کروں۔

”تم نے اس پر احتجاج نہیں کیا۔“ میں نے پوچھا۔

”کیا تھا لیکن اس نے اس کا کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ نہیں بتایا پھر میں نے سوچا حرج ہی کیا ہے۔ پہلے میں مفلسی کی زندگی بسر کرتی تھی اب عیش کر رہی ہوں اور ابھی تک مجھے کوئی ایسا کام بھی نہیں کرنا پڑا جس پر میرا ضمیر مجھے ملامت کرتا۔ لہذا میں خاموش ہو رہی۔ لیکن الجھن.... تم خود سوچو.... ایسی حالت میں کتنی الجھن ہو سکتی ہے۔ یورپ کی سیاحت ختم کر چکنے کے بعد اس نے ایشیا کی سیاحت کا پروگرام بنایا۔ اب ہم یہاں آئے ہیں۔ لیکن سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر اس سیاحت کا مقصد کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایشیا کی سیاحت کے بعد وہ مجھے ڈچ گی آنا لے جائے گا۔ جہاں اس کا بہت بڑا بزنس اور کروڑوں کی جائیداد ہے اور میں ہی دراصل اس کی وارث ہوں۔ کیونکہ وہ

لاولد ہے۔ اس نے شادی ہی نہیں کی تھی۔“

”تب تو تم بڑی خوش قسمت ہو۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

”میرے خدا.... میں لعنت بھیجتی ہوں ایسی خوش قسمتی پر.... تم یہ تو دیکھو کہ وہ اسی طرح میرے ساتھ ساتھ لگا رہتا ہے اور ہم اجنبیوں کی طرح ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہیں۔ لیکن اس کا مقصد نہیں معلوم ہوتا۔ جو کچھ وہ کہتا ہے اس پر میں یقین نہیں کر سکتی۔“

”کیا کہتا ہے۔“

”یہی کہ ڈچ گی آنا ایک عجیب و غریب ملک ہے۔ میں تمہیں وہاں کی زندگی کیلئے ٹریننگ دے رہا ہوں۔ لیکن جب پوچھتی ہوں کہ کیسی ہے وہاں کی زندگی تو جواب ملتا ہے کہ خود ہی دیکھ لو گی۔“

”اور وہ کسی نوجوان کو تمہارے قریب نہیں آنے دیتا۔“

”نہیں.... لیکن تمہارے متعلق اس نے ابھی تک کچھ نہیں کہا۔“

”اور تم پہلی بار کسی کو یہ داستان سنا رہی ہو۔“

”پہلی بار.... یقین کرو.... میں تنگ آ گئی ہوں اس الجھن سے۔ میں اس کے بہت بڑے بزنس اور کروڑوں کی جائیداد پر لعنت بھیج کر فرانس واپس جانا چاہتی ہوں۔ ایسی الجھن سے میں کبھی اپنی مفلسی کی زندگی میں بھی دوچار نہیں ہوئی۔“

”واقعی یہ داستان عجیب ہے۔“

”اب بتاؤ تم میری کیا مدد کر سکتے ہو۔“

”یہی سوچ رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ میں حقیقتاً سوچ رہا تھا کہ اس کے متعلق کیا کرنا چاہئے۔ یہ بات تو چانگ نے بھی کہی تھی کہ وہ کسی کے ہاتھوں کھ پتلی ہو رہی ہے اور چانگ اس آدمی کا پتہ لگانا چاہتا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ چانگ نے آج ہی صبح کسی ایسے آدمی کا ذکر کیا تھا جو ہماری رہائش گاہ کی نگرانی کر رہا تھا۔ یہ خیال بھی چانگ ہی نے ظاہر کیا تھا کہ ہو سکتا ہے سو فی اس سے بے خبر ہو اور اس آدمی نے نگرانی شروع کرائی ہو۔ مگر پھر میں نے سوچا کہ چانگ تو یورپ کی سیاحت کے دوران ہی سے ان کا تعاقب کرتا رہا ہوگا لہذا یہ آدمی جسے وہ اپنا چچا بتا رہی تھی کئی بار اس کی نظروں سے گزرا ہوگا۔ لہذا اسے اس کے متعلق بھی چھان بین کرنی ہی چاہئے تھی میں ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ بولی۔

”میرے خدا... قتل!“

”ہاں.... کوئی بڑی بات ہے۔ میں ابھی اسے یہیں قتل کرا سکتا ہوں۔ کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہو کہ وہ کیسے مر گیا۔ بس یہیں اسی کرسی پر ڈھیر ہو جائے گا۔ میں پرنس داراب ہوں لڑکی۔ جس کے نام سے پولیس بھی کانپتی ہے اور یہاں کے بد معاش بھی لرزتے ہیں اور مجھے ہر وقت خدشہ لاحق رہتا ہے کہ کہیں مجھے گولی نہ مار دی جائے۔“

”کیوں....!“ وہ بے حد خوفزدہ نظر آنے لگی۔

”اسی لئے کہ پولیس بھی میری دشمن ہے اور یہاں کے بد معاش بھی۔ لیکن میں پھر بھی آزادانہ گھومتا ہوں۔“

”کمال کرتے ہو.... نہیں تم جھوٹ بولتے ہو۔“ وہ ہنسنے لگی مگر اب بھی خوفزدہ نظر آرہی تھی۔

”اچھا تو تم دیکھو گی میرا کمال۔ میں ابھی پندرہ منٹ کے اندر اندر اس بوڑھے کا خاتمہ کرائے دیتا ہوں۔“

”کیسے.... کس طرح۔“

”بلوپاپ کے ذریعے۔“

”بلوپاپ کیا....؟“

”ایک پتلی سی نلکی جس میں زہریلی سوئی ہوتی ہے۔ اسے ہونٹوں میں دبا کر پھونکتے ہیں اور سوئی اس میں سے نکل کر شکار کے جسم میں جا چبھتی ہے اور وہ چشم زدن میں ختم ہو جاتا ہے۔ لڑکی میں ایک پراسرار شہزادہ ہوں۔ یہاں میرے آٹھ آدمی موجود ہیں جو ہر وقت میری حفاظت کرتے رہتے ہیں اور اکثر میرے دشمنوں کی موت انہیں کے ہاتھوں واقع ہوتی ہے۔ ان کے پاس بلوپاپ ہوتے ہیں۔ ننھے ننھے سانپ ہوتے ہیں جب جہاں جیسا موقع ہوا.... کیا سمجھیں۔“

وہ اپنے خشک ہوتے ہوئے ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی.... میں نے کہا۔ ”مگر میں اسے ختم نہیں کروں گا۔ میں یہ دیکھوں گا کہ اس کا مقصد کیا ہے۔ وہ کیوں تمہارا اچھا بن گیا ہے۔“

”جب تک تم دیکھو گے میں مرنے لگاؤں گی۔“

”نہیں اب میرے آدمی تمہاری بھی نگرانی کرتے رہیں گے۔ تمہیں ذرہ برابر بھی خائف نہیں ہونا چاہئے۔“

”تمہیں یہ سن کر حیرت ہوگی کہ بعض اوقات میں اسے پہچان ہی نہیں سکتی۔“

”میں نہیں سمجھا۔“

”وہ اپنی صورت تبدیل کر لیتا ہے اور مجھے آگاہ کر دیتا ہے کہ فلاں جگہ موجود ہوں اور اس شکل میں ہوں تم وہاں پہنچو۔ لیکن اگر تم سے کوئی غیر ذمہ دارانہ حرکت سرزد ہوئی تو نتیجہ کی تم خود ذمہ دار ہوگی۔“

”اوہ.... تو کیا اس وقت بھی وہ میک اپ میں ہے۔“

”ہاں.... وہ میک اپ ہی میں ہے۔“

”اور تمہیں خود کو پہچو ادیا ہے۔“

”ہاں یہ بات بھی مجھے الجھن میں ڈالتی ہے۔ اگر وہ میری نگرانی کرتا رہتا ہے تو مجھے صرف اسی بات سے آگاہ کر دے کہ وہ فلاں جگہ موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ میں اس سے خوف کھاؤں گی اور جو کچھ وہ کہتا ہے وہی کروں گی پھر آخر خود کو پہچوانے کی کیا ضرورت ہے۔“

”بات غور طلب ہے۔“ میں نے سر ہلا کر کہا۔

”پھر تم میری کیا مدد کر سکتے ہو۔“

”میں پتہ لگاؤں گا کہ وہ کون ہے اور کیا چاہتا ہے۔“

”نہیں تم یہاں کی پولیس کو اس کی اطلاع دے دو۔ خدا کے لئے جو کچھ بھی کرنا ہے جلدی کرو۔ اب مجھے بہت خوف معلوم ہونے لگا ہے۔“

”ارے بس....!“ میں نے ہاتھ ہلا کر کہا۔ ”عیش کرو عیش....!“

”یہ عیش مجھے پاگل بنا دے گا۔“

”تب تو میں تمہیں فرانس واپس نہیں جانے دوں گا۔“

”کیوں؟“

”عرصہ سے میری خواہش تھی کہ کسی پاگل لڑکی سے شادی کروں پتہ نہیں کیوں دل چاہتا ہے کہ کبھی کوئی لڑکی مجھے کاٹنے دوڑے اور میں چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھاؤں۔“

”شرم نہیں آتی کسی بے بس لڑکی کا مضحکہ اڑاتے ہوئے۔“ اس نے غمگین آواز میں کہا۔

”میں جانتا ہوں کہ تم بے بس نہیں ہو۔ جس وقت چاہو اسے قتل کر سکتی ہو۔“



”اب مجھے اور زیادہ خوف معلوم ہونے لگا ہے۔“

”تم ٹھہری کہاں ہو۔“

”آر لکچو.... روم ٹھر ٹین۔“

”اور.... وہ....!“

”میں نہیں جانتی.... وہ اب اپنی جائے قیام کے متعلق کچھ نہیں بتاتا۔ بس فون پر مجھے

اطلاع دیتا ہے کہ آج کہاں جانا ہے۔“

”لیکن میک اپ میں خود کو چھوڑنے کا کیا طریقہ ہے۔“

”اس کے بائیں ہاتھ میں ایک انگشتری ہے جس پر نگینے کی جگہ شیر کا سر بنا ہوا ہے بس وہ کسی

نہ کسی طرح انگشتری میرے سامنے کر دیتا ہے اور میں اسے پہچان لیتی ہوں۔ لیکن ایسا کبھی نہیں

ہوا کہ کہیں اس نے یہ نہ بتایا ہو کہ وہ وہاں موجود ہے۔ خود کو مجھ پر ضرور ظاہر کر دیتا ہے۔“

”یہ چیز الجھن میں ڈالنے والی ہے۔“ میں نے کہا اور خاموش ہو گیا۔ وہ بھی خاموش ہو گئی

تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ ان حالات کی اطلاع کر تل کو دوں گا اور چانگ کو تو فی الحال اس کی ہوا بھی

نہ لگنے دی جائے چونکہ کسی جرم کا ارتکاب خود ہمارے ملک میں ہونے والا تھا۔ اس لئے ہمارا فرض

تھا کہ پہلے ہم اسے اپنے نکتہ نظر سے دیکھتے۔ غالباً کر تل بھی میرے اس خیال کی تردید نہ کریں۔

چانگ حقیقتاً کسی چکر میں تھا۔ اس کا علم ممکن ہے کر تل کو رہا ہو۔ مجھے تو نہیں تھا۔ لہذا مجھے محتاط بنی

رہنا چاہئے۔ پھر میں نے سوچا کیا چانگ یہاں بھی موجود ہو گا۔ پچھلی رات تو وہ میرے پیچھے ہی لگا

رہا تھا۔ اگر وہ حقیقتاً یہاں موجود ہے تو مجھے سو فیاض کے چچا کا تعاقب کرنا چاہئے یا نہ کرنا چاہئے۔

”کیا سوچنے لگے“ سو فیاض نے ٹوکا۔

”کچھ نہیں اب تمہارے معاملے کے علاوہ اور کیا سوچوں گا۔ ویسے اگر تم کوئی نئی بات سوچنے

کا مشورہ دینا چاہو تو وہی اشارت کروں.... آہاں.... ٹھہرو.... بات دراصل یہ ہے کہ مجھے

تمہاری یہ کہانی کسی جاسوسی ناول کا پلاٹ معلوم ہوتی ہے۔“

”خود مجھے بھی معلوم ہوتی ہے۔“

”آخر میں اس پر یقین کروں یا نہ کروں۔“

”میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تمہیں یقین نہیں آئے گا۔“ اس نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔

”پھر کیا صورت ہو سکتی ہے مجھے یقین دلانے کی۔“

”یہی کہ اب میں ہی کسی اور کے ذریعہ یہاں کی پولیس کو اس سے باخبر کرانے کی کوشش

کروں۔“

”ابھی نہیں.... جب میں یہ دیکھوں گا کہ میں کچھ نہیں کر سکتا اس وقت میں بھی سوچوں گا

کہ پولیس کو مطلع کر دیا جائے۔“

وہ کچھ نہ بولی۔ اس کے چہرہ پر تھکن اور اکتاہٹ کے آثار نظر آنے لگے تھے۔

”ہاں یہ تو بتاؤ کہ تمپاسپورٹ پر یہاں آئی ہو یا غیر قانونی طور پر۔“

”پاسپورٹ پر.... لیکن میرے یہاں آنے کی وجہ یہ ہے کہ میرا ماموں یہاں کی ایک فرم

میں منیجر تھا جو پچھلے ماہ بیٹے کا شکار ہو کر چل بسا۔ میں اسی ماموں کا سامان سمیٹنے آئی ہوں۔“

”کیا حقیقتاً ایسا ہی ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں جانتی بھی نہیں کہ وہ کم بخت کون تھا۔ مجھ سے جو کچھ بھی کہا گیا تھا میں نے اس کی

اطلاع فرانسیسی سفارت خانہ کو دے دی ہے۔ میں نے سفیر کو یہی بتایا ہے کہ میں ڈکسن راجر کمپنی

کے سابق منیجر موسیو تنگل در یکساں کی بھانجی ہوں اور ان کی موت کے سلسلے میں یہاں آئی ہوں۔

لہذا اس کے سامان پر مجھے قبضہ دلویا جائے۔“

”اور تم اب بھی نہیں سمجھیں کہ تمہارا چچا کیا چاہتا ہے۔“

”نہیں.... میں نے سمجھنے کی کوشش کی تھی لیکن نہیں سمجھ سکی۔ تم یہی سوچو گے ناکہ وہ

بری آڈلے کر کسی شریف آدمی کا ترکہ تھہ یا ناچاہتا ہے۔“

”یقیناً....!“

”لیکن تنگل در یکساں نے کچھ بھی نہیں چھوڑا۔ اس کے متعلق معلوم ہوا ہے کہ وہ ایک

عیاش طبع آدمی تھا جو کچھ بھی کماتا تھا اڑا دیتا تھا۔ بینک میں اس کی کل پونجی ستائیس روپے بارہ

آنے پچی تھی سامان بھی کوئی ایسا قیمتی نہیں ہے اور میرے پچانے بھی اس کے متعلق کوئی خاص

بے چینی نہیں ظاہر کی تھی۔ ارے اسے ہٹاؤ.... میں کہتی ہوں یورپ کی سیاحت کا کیا مقصد تھا۔

وہاں بھی اس کا رویہ یہی تھا جو یہاں ہے کسی بات میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔“



”بہت ہوشیاری کی ضرورت ہے کیپٹن میں پھر تمہیں آگاہ کرتا ہوں۔“  
 ”شکریہ ڈیر... ٹانا...!“ میں نے کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا اور سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔

## شعلے کی ٹھنڈک

میں نے سوچا یہ چانگ بھی بڑا مستعد آدمی ہے۔ مگر کرل.... بھلا میں کس طرح سمجھ لیتا کہ انہوں نے یہ کیس مکمل طور پر میرے سپرد کر دیا ہے۔ انہوں نے کچھ دیر پہلے مجھے جو ہدایت دی تھی اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ ہمیشہ کی طرح اس بار بھی مجھے بیروں کی پالی میں چھوڑ کر خود دور سے حالات کا جائزہ لینا چاہتے ہیں۔ پھر میں چانگ کی ہدایت پر کیسے عمل کرتا۔

میں پھر ہال میں واپس آ گیا۔ سوفیا وہیں موجود تھی اور اس کے ہاڈی گارڈز شرابی پی رہے تھے۔ اسی سے میں نے اندازہ کر لیا کہ ان کی نظروں میں سوفیا کو کوئی احترام نہیں ہے۔

”تم نے دیکھا۔“ سوفیا آہستہ سے بولی۔ ”یہ میرے ہاڈی گارڈز ہیں۔ میرے چچا کے ملازم۔ تم انہیں دیکھو یہ کس بے باکانہ انداز میں شراب نوشی کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ میں کسی بد معاش آدمی کے چنگل میں پھنس گئی ہوں یہ میرا چچا ہر گز نہیں ہو سکتا۔ کیا ممکن نہیں ہے کہ وہ اس وقت بھی میک اپ میں رہا ہو جب وہ میرے چچا کی حیثیت سے سامنے آیا تھا۔“

”ہو سکتا ہے۔“ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔

”یہ بھی ممکن ہے وہ میرے چچا سے واقف ہو جو ڈنچ گی آنا میں رہتا ہے اور اسی واقفیت سے فائدہ اٹھا رہا ہو۔ کاش مجھے اپنے چچا کا پتہ معلوم ہوتا۔ کاش میں یہ معلوم کر سکتی کہ وہ ڈنچ گی آنا میں کہاں رہتا ہے۔“

میں بہت زیادہ بکواس کر چکا تھا لہذا اب میں نے خاموش ہی رہنا مناسب سمجھا۔ کاش کرل یا چانگ مجھے سارے حالات سے آگاہ کر دیتے پھر میں دیکھتا کہ میں تنہا کیا کر سکتا تھا۔

کرل شاید یہ سمجھتے ہیں کہ میں نرا ڈیوٹ ہوں۔ پتہ نہیں کیا بات ہے کہ ان کی موجودگی میں بچہ بن جانے کو دل چاہتا ہے۔ بس یہی خواہش ہوتی ہے کہ حائقوں پر حائقیتیں کئے جاؤ۔ لیکن

میں پھر سوچ میں پڑ گیا۔

”کیا سوچنے لگے۔“

”یہی کہ ممکن ہے وہ اسی تکل در یکساں کو یورپ میں تلاش کر رہا ہو اور اب یہاں اس کا

سراغ ملا ہو۔“

”لیکن اب بھی اس کی پرانی حرکتیں جاری ہیں۔“

”خیر میں اس مسئلے پر اطمینان سے غور کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے کہا اور اسی وقت میں نے اس کے چچا کو اٹھ کر ہال سے باہر جاتے دیکھا۔ سوفیا نے اس پر حیرت ظاہر کی کیونکہ اس کی یادداشت میں پہلی بار اس نے ایسا کیا تھا۔ ورنہ وہ کسی تفریح گاہ میں اسے تنہا نہیں چھوڑتا تھا۔ سوفیا کے بیان کے مطابق جب اسے کہیں سے اٹھنا ہوتا تھا تو وہ کسی نہ کسی طرح سوفیا کو اپنے ارادے سے آگاہ کر دیتا تھا اور دونوں آگے پیچھے ہی وہاں سے رخصت ہوئے تھے مگر آج ایسا نہیں ہوا تھا۔ وہ اسے مطلع کئے بغیر اٹھ گیا تھا اور اب سوفیا کہہ رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ کیا وہ بھی اٹھ جائے۔ مگر اس نے اٹھنے کا اشارہ نہیں کیا تھا۔ ہم اس پر ابھی بحث کر رہے تھے کہ لاؤڈ سپیکر پر

اعلان ہوا۔

”پرنس داراب پلینز... آپ کی فون کال ہے... براہ کرم فیجر کے کمرے میں تشریف لائیے۔“

میں نے سوچا ممکن ہے کرل ہوں لیکن میں نے تو انہیں ابھی تک پرنس داراب کی کہانی نہیں سنائی تھی۔ میں اٹھ کر فیجر کے کمرے میں آیا اور فون پر پہلی ہی بار مخاطب کی آواز پہچان لی۔ دوسری طرف سے چانگ بول رہا تھا۔ ”کیپٹن تم خطرے میں ہو۔ میں کلب کے باہر والے فون بوتھ سے بول رہا ہوں۔ ابھی ابھی ایک بوڑھا یوروپین باہر آیا ہے اور اس نے تین آدمیوں کو تمہارے متعلق کچھ ہدایت دی ہیں۔ میں صاف نہیں سن سکا۔ لیکن تم ہوشیار رہو۔ اگر وہ لڑکی تمہیں کہیں لے جانا چاہے تو ہر گز نہ جانا۔ ویسے اس کا قیام آر لکچو میں ہے لیکن یہ بوڑھا یوروپین مجھے پہلی بار دکھائی دیا ہے۔“

”اس کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے۔“

”یہی کہ وہ اسی لڑکی کے ساتھیوں میں سے ہو سکتا ہے۔“

”میں ابھی یہاں بیٹھوں گا تم فکر نہ کرو۔“

آپ واقف ہی ہیں کہ ان کی عدم موجودگی میں مجھ سے بھی اکثر کتنے شاندار کارنامے ”سرزد“ ہو جاتے ہیں۔

”تم کیا سوچنے لگے۔“ سوفیا کی آواز پر میں چونک پڑا۔

”میں یہ سوچ رہا ہوں کہ مجھے کیا سوچنا چاہئے۔“

”میری الجھن بڑھتی جا رہی ہے۔ آخر وہ اٹھ کیوں گیا۔ کیا اب واپس نہیں آئے گا۔ کیا میں ساری رات یہیں بیٹھی رہ جاؤں گی۔“

چلو میں تمہیں آر لکچو پہنچا دوں۔“

”نہیں میں اس وقت یہاں سے نہیں اٹھ سکتی جب تک کہ اس کی طرف سے اٹھ جانے کا اشارہ نہ ملے۔“

”تم ڈرتی کیوں ہو.... چلو میں ہوں تمہارے ساتھ.... اطمینان رکھو۔ تمہیں کوئی بھی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔“

”میں اس سے بہت ڈرتی ہوں.... بے حد.... پر نس اب میں چاہتی ہوں کہ مری جاؤں۔“

”تھوڑی ہمت کرو.... میں چنگی بجاتے اس سے رہائی دلا دوں گا۔“

دفعۃً چونک پڑی۔ میں نے کنکھیوں سے دروازے کی طرف دیکھا۔ بوڑھا یوروپین ہال میں داخل ہو رہا تھا۔

وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔ ”اشارہ مل گیا میں جا رہی ہوں۔“

میں کچھ نہ بولا۔ وہ اٹھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی دونوں باڑی گاڑ بھی اٹھ گئے۔ لیکن یوروپین بیٹھا رہا۔ مجھے چانگ کی گفتگو یاد آئی۔ اس نے کہا تھا کہ وہ بوڑھا پہلی بار اس کی نظروں سے گذرا

ہے۔ اس کا یہ مطلب تھا کہ وہ ان میں سے بہتروں کا صورت آشنا تھا۔ ویسے شاید اس کو اس آدمی کی تلاش تھی جسے سوفیا کی وساطت سے میں نے دریافت کر لیا تھا۔ یہ تو آج کی بات تھی لیکن

آئندہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ میرے قریب سے گذر جائے اور میں نہ پہچان سکوں کیونکہ سوفیا کے بیان کے مطابق وہ ہمیشہ ایک ہی طے میں نہیں رہتا تھا۔ پھر مجھے کیا کرنا چاہئے۔ اگر میں نے

آج اس بوڑھے کا تعاقب نہ کیا تو ہو سکتا ہے وہ کبھی ہاتھ نہ آئے۔

پچھلی رات اس نے سوفیا کے بیان کے مطابق مجھے طرح دی تھی۔ لیکن آج چانگ نے فون

پر کسی سازش کی کہانی سنائی تھی۔ گویا اب وہ مجھ پر ہاتھ صاف کرنا چاہتا ہے۔ لیکن سوفیا نے یہ نہیں بتایا کہ کبھی اس سے پہلے بھی اس کے کسی ملنے والے پر ہاتھ صاف کیا گیا تھا یا نہیں۔ اس نے یہی کہا تھا۔ صرف کہا ہی نہیں تھا بلکہ اس پر حیرت بھی ظاہر کی تھی کہ اسے مجھ سے ملنے سے نہیں روکا گیا تھا۔ حالانکہ پہلے کئی بار اسے ایسی ملاقاتوں سے روکا گیا تھا.... پھر.... اگر اب کسی نئے ملنے والے کے خلاف کسی قسم کی سازش بھی کی جائے تو یہی سوچا جاسکتا ہے کہ وہ ملنے والا کسی قسم کی کوئی اہمیت رکھتا ہے۔ لہذا میرے ساتھ کون سی اہمیت ہو سکتی تھی۔ سوائے اس کے کہ میں محکمہ سراغ رسانی کا ایک آفیسر تھا۔ اگر اس بوڑھے نے اسی اہمیت کو مد نظر رکھ کر میرے خلاف کوئی سازش کی تھی تو اس کا یہی مطلب ہو سکتا تھا کہ وہ ایک بہت زیادہ باخبر آدمی ہے اور میں میک اپ میں بھی پہچان لیا گیا ہوں۔

اس نتیجے پر پہنچنے کے بعد میں نے سوچا کہ کرنل کو اس کی اطلاع ضرور دی جائے، ورنہ ہو سکتا ہے کہ میں کسی مصیبت میں پڑنے کے بعد بھی کسی الو کالخت جگر سمجھا جاؤں۔ حالانکہ آج تک کسی الو نے مجھے اپنا لخت جگر نہیں سمجھا۔

میں نے فیئر کے کمرے میں جا کر کرنل کے لئے رنگ کیا۔ لیکن وہ گھر پر نہیں ملے۔ ہر وہ مقام فون پر کھنگال ڈالا جہاں ان کے ملنے کے امکانات ہو سکتے تھے مگر مایوسی ہی ہوئی۔ پھر کوشش کی کہ امرنگھ یا رمیش ہی میں سے کوئی مل جائے لیکن تو بہ کیجئے.... اس رات تو سر پر چھپکلی سوار تھی۔ میں یہی کہوں گا کیونکہ مجھے چانگ کا گھر نہیں یاد آیا جہاں میں خود رہتا تھا اور میرے تین آدمی اس وقت بھی موجود تھے۔ اس عمارت میں فون بھی تھا۔ لیکن یقین کیجئے اس عمارت کو سرے سے بھول ہی گیا تھا۔

جب میرے سر پر چھپکلی سوار ہوتی ہے تو عموماً یہی ہوتا ہے۔ جوش شجاعت میں کچھ ایسی حماقتیں سرزد ہوتی ہیں جن کا جواب مشکل ہے۔ مگر کبھی کبھی اسی چھپکلی نے جو میرے سر پر سوار ہوتی ہے مجھے تیس مارخاں بھی بنا دیا ہے۔ نہیں سمجھے۔ بھی یہ تیس مارخاں کا لطیفہ بھی عجیب ہے ہم آپ بات بات پر تیس مارخاں بننے ہیں۔ لیکن اس کی کہانی شاید ہی عام طور پر لوگوں کو معلوم ہو۔ آپ کہیں گے ادھر ادھر کی کہانیاں سنائے بیٹھ گیا۔ میں کہتا ہوں ہرج ہی کیا ہے۔ اب میں تذکرہ نویس صاحب کی طرح رنگ آمیزیاں تو کر نہیں سکتا۔ لیکن کسی نہ کسی طرح اس کہانی کو

وچسپ بنانا بھی ضروری ہے۔ ورنہ آپ کہیں گے کہ بس حمید صاحب آپ کا جو کام ہے وہی کیا کیجئے ہاتھ میں فلم لینا آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔ ویسے آپ مطمئن رہئے میں ابھی آپ کے دل کو سرد اور آنکھوں کو نور اس خبر سے بخش دوں گا کہ اس رات کیسی مرمت ہوئی تھی۔

ہاں تو قصہ تیس مارخاں کا یہ ہے کہ کسی شہر میں دو میاں بیوی رہتے تھے۔ رہتے نہیں تھے بلکہ انہیں رہنا پڑتا تھا۔ نہ رہتے تو جاتے کہاں۔ نہ اکیلا مرد میاں ہو سکتا ہے اور نہ اکیلی عورت بیوی۔ حالانکہ میاں بیوی ہو جانے کے بعد وہ اکثر سوچتے ہیں کہ اکیلے ہی ہوتے تو بہتر تھا۔ اس لئے یہی عرض کروں گا کہ انہیں رہنا پڑتا تھا۔ دونوں ایک دوسرے سے بیزار تھے۔ بیزاری کی وجہ یہ تھی کہ بیوی میاں صاحب کو بگاڑ بنانا چاہتی تھی لیکن میاں صاحب بے کاری رہنے پر مصر تھے۔ وہ انہیں لاکھ لاکھ غیرت دلاتی۔ اسلاف کے کارنامے گنوا کر ان کا خون گرم کرنے کی کوشش کرتی مگر میاں اس سے مس نہ ہوتے۔ آخر بیوی نے تنگ آکر فیصلہ کیا کہ اب اس سے پیچھا ہی چھڑانا چاہئے۔ نہ یہ کمائے گا اور نہ میرا ہی پیچھا چھوڑے گا۔ لہذا اس نے ایک دن میاں صاحب کو بھنگ پلا دی اور پھر ان کے خون کو گرم کرنا شروع کیا۔ خون گرم ہو گیا جناب۔ آپ نے سینے پر ہاتھ مار کر کہا۔ میں شاہی فوج کے لائق ہوں۔ یقیناً مجھے کوئی عہدہ ملنا چاہئے۔ بیوی نے کہیں سے ایک تلوار مہیا کی اور انہیں دربار شاہی کا راستہ بتا دیا۔ اس ملک کا بادشاہ چونکہ بے حد قوالی پسند آدمی تھا۔ اس لئے ہر ایک کو بھرا کرنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ جس وقت میرا شیر ہنکارا تو ہوا دربار میں پہنچا۔ وہاں قوالی ہی ہو رہی تھی۔ بادشاہ سلامت بحالت وجد نہ جانے کیا کر رہے تھے کہ میاں صاحب نے لکار کر کہا۔ ”میں شاہی فوج میں سپہ سالاری کے لائق ہوں۔“ بادشاہ سلامت سمجھے کہ شاید اسے بھی حال آ گیا ہے۔ لہذا انہوں نے بحالت وجد کہا ہم نے تمہیں سپہ سالار مقرر کیا۔ تمہارا نام کیا ہے۔ جواب میں میاں صاحب نے اکر کر فرمایا۔ ہم میں مارخاں ہیں۔ یعنی ایک حملے میں تیس آدمیوں کا صفایا کر دینا ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ بادشاہ سلامت اتنے خوش ہوئے کہ انہوں نے قوالی کوادی اور وزیر سے فرمایا کہ اسے سپہ سالار مقرر کیا۔ وزیر نے عرض کی حضور یہ یہاں ہماری محفل میں نہیں تھا۔ باہر سے آیا ہے۔ بولے کچھ پرواہ نہیں جو ہم نے کہا دیا اکل ہے۔

بس جناب وہ سپاہ سالار بنا دیئے گئے اور اس سے پہلے والا سپہ سالار جو خود بھی قوالی کا بے حد

شائق تھا سجدہ شکر بجالایا یعنی اس کی گلو خلاصی ہو گئی۔ اور وہ اس کے بعد سے اپنے گلے میں ہار موہیم لٹکانے لگا۔ وہ ملک ایسا ہی تھا کہ فوج بڑے بڑے کھایا کرتی تھی۔ قریب کی ملکیتیں اس ملک پر قبضہ کرنے کے متعلق اس لئے نہیں سوچتی تھیں کہ کہیں خود ان کی فوجیں بھی نہ قوالی کا شکار ہو جائیں۔ اگر کبھی کسی ملک کو کچھ ایٹھنا ہوتا تو وہ پہلے تو الٹی میٹم دیتا اور جب قوالی پسند ملک کی فوجیں سرحدوں پر خندق نشین ہو جاتیں تو وہ اپنے ہوائی جہاز سے پیراشوٹ کے ذریعہ قوالوں کی پارٹیاں اتار دیتا اور وہ پارٹیاں اوپر ہی سے الٹا شروع کر دیتیں۔ پھر حالت یہ ہوتی کہ سپاہی خندقوں سے نکل کر ان کے گرد اکٹھا ہونے لگتے۔ محاذ جنگ پر چاروں طرف محفلیں جم جاتیں اور ”اے وا“ پھر حملہ آور ملک کی فوج بے دریغ اندر گھس چلی جاتی اور لوٹ مار کر کے بڑے سکون کیساتھ واپس بھی چلی جاتی۔ لیکن قوالی پسند فوجوں کو اتنا ہوش کہاں کہ معاملات ان کی سمجھ میں آسکیں۔ پھر قوال بھی رخصت ہوتے وقت ان سے کافی لمبی لمبی رقصیں ایٹھ لے جاتے۔ مگر ایک بار ایسا ہوا کہ کسی دور دراز ملک کی فوج نے سرحد کے قریب ڈیرہ ڈال دیا۔ بادشاہ سلامت بوکھلا گئے۔ انہوں نے وزیر سے کہا کہ اب باند پیر یہ کیسا حملہ ہے نہ قوال اترے نہ قوالی ہوئی۔ اور یہ لوگ چڑھ دوڑنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ یعنی اگر ہم نے ان کے مطالبات پورے نہ کئے تو جلد وہ حملہ کر دیں گے اور ہم جانتے ہو وزیر باند پیر کہ ہم کسی سے دینا تو جانتے ہی نہیں۔ ویسے یہ اور بات ہے کہ وہ قوالی کرامیں اور ہم بحالت وجد انہیں نہ لوکیں کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ شاہی خزانہ کیوں لوٹ رہے ہیں۔ مگر کچھ تو بتاؤ اب ہم کیا کریں۔ ہم نے سنا ہے کہ ان کی فوج میں ایک بھی قوال نہیں ہے۔ وزیر نے مشورہ دیا کہ اس موقع پر میں مارخاں کو نہ بھولنا چاہئے جس نے ایک حملہ میں تیس آدمی مارنے کا دعویٰ کیا تھا۔ بادشاہ سلامت اچھل پڑے اور وہ اس خبر سے قوالی ہی کا سا اثر لینے کی تیاری کر رہے تھے کہ وزیر باند پیر نے انہیں ہوشیار رہنے کا مشورہ دیا۔ پھر تیس مارخاں بلوائے گئے اور انہوں نے آتے ہی کہا۔ ”جہاں پناہ فوج نے اس بناء پر لڑنے سے انکار کر دیا ہے کہ حملہ آوروں کے ساتھ قوال نہیں آئے۔ جہاں پناہ نے فرمایا فکر کس بات کی ہے تم تنہا ہی حملہ آوروں سے پیٹ لو گے۔ ایک حملے میں تیس مارتے ہو۔ اچانک تیس مارخاں کو وہ کھیاں یاد آگئیں جو گھر پر میں کیا میں ہزار بھی بہ آسانی ماری جا سکتی تھیں۔ مگر ایک نہ چلی۔ وہ شاہی فیصلہ تھا۔ تیس مارخاں نے قوالی کرتے ہوئے کہا کہ میں آج رات کو ان کا



ہ نایا کردوں گا۔ مگر ٹھہریے۔ میں ابھی حاضر ہو کر بتاتا ہوں۔ پوری اسکیم غرض کروں گا۔ انہیں گہرا پس جانے کی اجازت مل گئی۔ لیکن وزیر جو واقعی باتدبیر تھا اس نے چار اپنے آدمی تھیں مارخاں کے ساتھ کر دیئے۔

وہ گھر آئے بیوی کو وہ دن یاد دلایا جب اس نے انہیں گرما کر دربار بھجوا دیا تھا۔ بیوی کو وہ دن اب بھی یاد تھا۔ کیونکہ وہ اسی دن کی بدولت آج عیش کر رہی تھی۔ جب اس نے اعتراف کیا کہ اسے وہ دن اچھی طرح یاد ہے تو دھڑ سے بولے خدا کے لئے وہی شربت پھر پلا دو جو اس دن پلایا تھا اور پھر اسی قسم کی باتیں کرو۔ بیوی نے وجہ پوچھی اس پر وہ قوالی کے بغیر بیان کر چلے۔ مگر اب بیوی ان سے چھٹکارا پانے پر کسی طرح بھی تیار نہیں تھی۔ اس نے مشورہ دیا کہ کہیں بھاگ چلو۔ انہوں نے فرمایا باہر چار آدمی موجود ہیں۔ یوں کام نہیں چلے گا تم پلاؤ شربت۔ میں ایک بار پھر بادشاہ سلامت کے دربار میں حاضری دوں۔ اس کے بعد شاید پھر ان آدمیوں سے چھٹکارا مل جائے جو میرے ساتھ یہاں تک آئے ہیں۔ بس اب پلاؤ۔ شربت۔ واپس آکر پوری اسکیم بتاؤں گا۔ چنانچہ اس نیک بخت نے انہیں پھر بھنگ پلا دی اور چنگیز دہلا کو کے تذکرے چھیڑ کر ان کا خون گمانے لگی۔ میان صاحب جلد ہی موڈ میں آگئے اور ایسے موڈ میں آئے کہ چھپاک سے تلوار کھینچ لی۔ بیوی سمجھی شاید فارغ البال ہو جانے کا ارادہ رکھتے ہیں اس لئے چیخ مار کر بھاگی اور ایک کوٹھری میں گھس گئی۔ آپ نے بھی ایک نعرہ جگر خراش مارا اور گھر سے نکل آئے۔ اب وہ چیختے چنگھاڑتے اور تلوار ہلاتے شاہی محل کی طرف جا رہے تھے۔ ہلڑ ہو گیا سارے شہر میں۔ لوگوں نے پہلے ہی ان کی تیس مارغانی کے وہ قصبے سن رکھے تھے جو انہوں نے اکثر احباب کو سنائے تھے۔ بہر حال یہ حضرت شاہی محل میں پہنچے۔ بادشاہ سلامت اور وزیر باتدبیر تھلے میں تھے۔ انہیں بھی وہیں بلوایا گیا۔ انہوں نے وہاں پہنچتے ہی ہڑبونگ مچا دی۔ چیختے رہے۔ اچھلتے رہے۔ اور اس طرح پیترے بدل بدل کر تلوار ہلاتے رہے جیسے بچ ایک ایک دار میں تیس تیس کا صفایا کر رہے ہوں۔ جہاں پناہ اور وزیر باتدبیر اس خیال سے کونے گھرے میں چھپنے لگے کہ ہاتھ ہی ہے اگر خدا نخواستہ بہک گیا تو کیا ہو گا۔ لیکن جب تیس مارخاں کے جوش و خروش میں کمی نہ ہوئی تو تنگ آکر جہاں پناہ اور وزیر باتدبیر نے صرف تالیوں ہی پر قوالی شروع کر دی۔ تیر نشانے پر بیٹھا۔ تدبیر کار گر ہوئی۔ شربت نے پھر دماغ الٹ دیا اور تیس مارخاں تلوار پھینک کر حال کے بھاؤ بتانے

لگے۔ ”ارے ہاں۔۔۔۔۔ جان دے دیں گے۔۔۔۔۔ اچی ہاں جان دے دیں گے۔۔۔۔۔ اے واجان دے دیں گے۔۔۔۔۔ پیاجی جان دے دیں گے۔۔۔۔۔ راجاجی جان دے دیں گے۔“

تیس مارخاں گاتے اور ”ٹھک ٹھک“ کرتے رہے۔ اسی دوران میں شربت کا اثر بھی آہستہ آہستہ زائل ہوتا رہا تھا۔ لہذا اچانک انہیں خیال آیا کہ انہوں نے یہ کیا شروع کر دیا۔ ادھر جہاں پناہ اور وزیر باتدبیر بھی قوالی کرتے کرتے تھک گئے تھے۔ جیسے ہی وہ خاموش ہوئے آپ بھی اپنے حال میں بریک لگاتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر بولے سرکار مجھے غصہ آ گیا تھا۔ اس پر جہاں پناہ نے خوش ہو کر پوچھا اب تو اترا گیا نا۔۔۔۔۔ تیس مارخاں کا جواب اثبات میں سن کر جہاں پناہ اور زیادہ خوش ہوئے اور وزیر باتدبیر کی جان میں جان آئی۔ اتنے میں تیس مارخاں نے کہنا شروع کیا۔ غصہ اس لئے آیا تھا جہاں پناہ کہ وزیر صاحب نے مجھے منہ چور سمجھ کر اسی وقت میرے پیچھے چار آدمی لگا دیئے تھے۔ جب میں پر دادا مرحوم کی بیاض خاص میں تنہا کسی لشکر پر بھاری رہنے کی تدبیر دیکھنے جا رہا تھا۔ کیا بتاؤں وہ چاروں جہاں پناہ کے اقبال سے خج گئے ورنہ کھیرے کلڑی کی طرح کاٹ کر ڈال دیتا۔ جہاں پناہ نے یہ سن کر فرمایا چولہے میں جھونکو وزیر صاحب کو یہ بتاؤ تم نے تدبیر دیکھ لی یا نہیں۔ تیس مارخاں بولے دیکھ لی سرکار۔ کل صبح میں دشمن کی ساری فوج کا صفایا کردوں گا اور اگر اپنی مدد کے لئے آدھا سپاہی بھی مانگوں تو میرے سر پر قلم رکھ دیجئے گا۔ وزیر نے فوراً تصحیح کی کہ سر قلم کر دینا محاورہ ہے۔ تیس مارخاں ترسے بولے وزیر صاحب آپ کو بھی یہ لیاقت ہوئی کہ جہاں پناہ کے سامنے زبان کھولیں ارے وہ مالک ہیں چاہیں تو محاورہ کا بھی سر قلم کر سکتے ہیں۔ اس پر جہاں پناہ کو جلال آ گیا اور گرج کر بولے۔ ہاں اے وزیر ابن خنزیر پر ہم چاہیں تو محاوروں پر پورا ایک ناول لکھ کر پبلک کو بور کر سکتے ہیں۔ کوئی ہمارا کیا کر لے گا۔ تیس مارخاں نے سوچا کہ اب بات نہ بڑھتے تو بہتر ہے۔ کیونکہ ابھی تو بہت کچھ کرنا ہے غرضیکہ وہ وعدہ کر کے گھر پلٹ آئے کہ صبح دشمنوں کا قلع قمع ہو جائے گا اور وہ آج رات پھر جنگل میں پر دادا مرحوم کی تدبیر کا جال پھیلائیں گے۔ ادھر بیوی منتظر تھی کہ دیکھو اب کون سی تدبیر فرما کر گھر واپس آتے ہیں۔ اس نے تدبیر سنی اور خوش ہو گئی۔ تدبیر یہ تھی کہ جتنا بھی نقدی ہے یا زیورات کی شکل میں ہے سمیٹ کر راتوں رات کسی طرف نکل جائیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ جب رات کچھ بھگ گئی تو میاں صاحب نے نقدی اور زیورات کا صندوق پر پر رکھا اور بیوی کا ہاتھ پکڑے ہوئے گھر سے باہر

یہ کہانی ختم ہو گئی۔ اب آپ غالباً سمجھ گئے ہوں گے کہ تیس مارخاں کے کہتے ہیں اور آپ جانتے ہی ہیں کہ میں بھی اکثر ایسے ہی اتفاقات کے تحت ماسٹر آف پوزیشن بن کر تیس مارخاں انجام دے چکا ہوں۔ لیکن یہ میری بد قسمتی ہے کہ مجھے آج تک کوئی ایسی تیس مارخاں نہیں ملی جو مجھے بھگ پلا کر کرل سے بھڑا دیتی۔

ہاں تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ سو فی جلی گئی تھی اور میں کرل وغیرہ کے لئے فون پر نمبر ڈائل کرتے کرتے تھک گیا تھا۔ آہا ٹھہریے ایک بات اور یاد آئی۔ آپ تیس مارخاں کی کہانی پر پور تو نہیں ہوئے۔ بھی میں نے یہ داستان تیس مارخاں کی کہانی تک لکھ کر اپنے تذکرہ نویس صاحب کو دکھائی تھی۔ وہ بولے حمید صاحب آپ نے فن کا خون کیا ہے جہاں سے آپ نے تیس مارخاں کی کہانی شروع کی ہے اس سے پہلے آپ سس پنس پیدا کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن تیس مارخاں کی کہانی اس کا اثر پڑھنے والوں کے ذہن سے یکسر غائب کر دے گی۔ میں نے کہا غائب کر دے۔۔۔ میں تو پڑھنے والے کو اپنے ساتھ لے چلا جاتا ہوں۔ اس طرح کہ نہ وہ پیچھے مڑ کر دیکھے اور نہ اسے اس کی فکر ہو کہ آئندہ کیا پیش آنے والا ہے۔ بس ہم دونوں ہنستے کھیلتے ہوئے آگے بڑھتے رہیں کیونکہ بعض اوقات سس پنس ایسی الجھن میں مبتلا کرتا ہے کہ بقیہ کتاب پھاڑو۔۔۔ چباؤ اور نگل جاؤ۔

ہاں تو میں نے اسی سس پنس کی دم پر ہاتھ رکھ کر عرض کیا تھا کہ میرے سر پر چھپکلی سوار تھی۔ وہ چھپکلی جس نے مجھے اکثر تیس مارخاں بنا دیا ہے۔ اس چھپکلی کا تقاضہ ہے کہ جواری بنو۔ جو کچھ کرنا ہے سوچے سمجھے بغیر کر ڈالو۔۔۔ یا اس پار یا اس پار۔۔۔ لیکن اس بار سب کچھ سوچنے کے باوجود بھی چھپکلی بدستور سر پر سوار رہی۔ میں نے سوچا نہیں بیٹھے بیٹھے رات گزار دینا حماقت ہو گی۔ اب اٹھو بھی حمید صاحب آخر کرل کیسے ان دیکھے حملوں سے بچ جاتے ہیں۔ تم بھی ذرا بجلی کی سی نظر رکھنا اور پھر چانگ جو اس طرح تمہارے ساتھ لگا رہتا ہے کیا اب غافل ہو گیا ہو گا۔ ہو سکتا ہے کہیں کرل بھی اس پاس موجود ہوں۔

میں اٹھا اور باہر آیا۔ اب میں کمپاؤنڈ کے اس ویران حصے کی طرف جا رہا تھا جہاں میں نے لیکن کھڑی کی تھی۔ یہاں کئی گاڑیاں اور بھی تھیں مگر ان پر کوئی موجود نہیں تھا۔ ادھر عموماً وہی لوگ اپنی گاڑیاں پارک کرتے تھے جو خود ہی انہیں ڈرائیو کر کے یہاں تک لاتے تھے۔

ہو لئے۔ اندھیری رات تھی اور شہر میں سناٹا تھا۔ انہوں نے سرحد پار کر جانے کے لئے جو راستہ اختیار کیا تھا اس سے بھگ کر ادھر جانے لگے جہاں دشمن کی فوجیں پڑی ہوئی تھیں۔ اچانک تیس مارخاں کو غلطی کا احساس ہوا اور وہ صندوقچے سمیت تیس مارخاں پر ڈھیر ہو گئے۔ نقدی اور زیورات کی اتنی زبردست کھکھناہٹ سن کر پہرے دار بوکھلا گئے وہ سمجھے شاید حریف نے شب خون مارا ہے۔ اندھیرا تو تھا ہی ان کی ہوشیار خبر دار۔۔۔ جانتے نہ پائے۔ سن کر سوتے ہوئے سپاہی بیدار ہوئے اور جو کچھ بھی ہاتھ لگا لے کر ایک دوسرے پر ٹوٹ پڑے۔ تلواریں چلنے لگیں۔ وہ چیخ و دھاڑ مچی کہ خدا کی پناہ۔۔۔ بیچارے تیس مارخاں اور تیس مارخاں ایک تھڑی میں جھپے ہوئے بڑی طرح کا پ زبے تھے۔ انہیں اس کا بھی ہوش نہیں تھا کہ جنگل ہی کی طرف بھاگ لینے۔

صبح تک تلواریں چلتی رہیں اور وہ ایک دوسرے کو مارنے کا نئے نئے رہے۔ ادھر اس غل غپاڑے کی صدا شہر تک پہنچی اور چاروں طرف ہر کارے دوڑنے لگے۔ جہاں پناہ اور وزیر قوالی بھول گئے۔ ادھر صبح ہو رہی تھی اجالا پھیلتے ہی غنیم کی سپاہ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ ان کی تعداد بہت تھوڑی رہ گئی تھی۔ انہوں نے شاید سوچا کہ اگر اب یہاں سے بھاگنے میں جلدی نہ کی تو ممکن ہے حریف ہی آپڑے اور پھر بھاگتے راستے بھی ملے تو نہ بھاگا جائے۔ لہذا وہ سب کچھ وہیں پھوڑ کر بھاگ لئے۔ تیس مارخاں کی جان میں جان آئی اور ساتھ ہی عقل بھی آئی۔ انہوں نے چپکے سے بیوی کو مخاطب کیا۔ اب تم تو چپ چاپ جنگل کی طرف کھسک جاؤ اور وہیں سے گھر چلی جانا۔ کیوں کہ اب میں تیس مارخاں شروع کرنے جا رہا ہوں۔

بیوی حسب ہدایت کھسک گئی اور تیس مارخاں جھڑیوں سے نکل کر مرنے والوں کے خون میں لوٹ لگانے لگے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود بھی سرے سے پیر تک خون میں نہا گئے۔ ادھر ہر کاروں نے جا کر جہاں پناہ کو خبر پہنچائی کہ غنیم کا لشکر ہزاروں کا کھیت چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ جہاں پناہ خوش ہو کر قوالی شروع کرنے ہی والے تھے کہ وزیر نے کہا چلے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ جہاں پناہ کی سواری میدان کارزار کی طرف روانہ ہو گئی۔ یہاں تیس مارخاں تلوار سونتے ہوئے ہوائے لڑ رہے تھے اور ان کے قدموں میں ہزاروں لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے لڑتے لڑتے انہیں حال آ گیا ہو۔ جہاں پناہ نے حد خوش ہوئے اور تیس مارخاں کو ہوش میں لا کر آئندہ سال ایک خلعت فاخرہ عطا کرنے کا وعدہ کیا بلکہ اسی وقت قانون کی بے حد عزت افزائی کی۔



میں اپنی گاڑی کے قریب پہنچ کر رُک گیا۔ اس سے پشت لگائی اور متحس نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگا۔ اس وقت دراصل کرئل میرے ذہن میں تھے اور میں انہیں کی نقل کر رہا تھا۔

پھر میں گاڑی میں بیٹھنے ہی والا تھا کہ مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی پانی بھرار بر کا غبارہ میرے چہرے سے نکل کر پھٹ گیا ہو۔ لیکن وہ تو آگ کی لپک تھی جو میرے چہرے پر پھیل گئی تھی ایک پل کے لئے کوندا سا لپکا تھا۔ میرا چہرہ جھلس گیا۔ مگر کیا وہ آگ سے جھلس جانے کی سوزش تھی.... ہرگز نہیں.... وہ.... وہ.... تو.... ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میری کھوپڑی کسی نے برف کے برادے کے ڈھیر میں ٹھونس دی ہو.... کتنی ٹھنڈک تھی.... کتنی تکلیف وہ ٹھنڈک.... ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے میرے شانوں پر سر کی بجائے برف کی سل رکھی ہو۔ پھر یہ ٹھنڈک بڑی تیزی سے سارے جسم میں پھیل گئی۔

اس کے بعد مجھے ہوش نہیں کہ پھر کیا ہوا۔

پتہ نہیں کتنی دیر بعد ہوش آیا.... ہوش کیا آیا ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے روئیں روئیں میں سوئیاں سی چبھ رہی ہوں اور اس جھپٹ کے علاوہ مجھے اور کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد آنکھوں کے سامنے پھیلی ہوئی دھند ہٹی اور مجھے کرئل کا چہرہ نظر آیا۔ وہ مجھ پر جھکے ہوئے تھے اور میں پتہ نہیں زمین پر تھا یا آسمان پر۔ جسم زمین پر رہا ہو اور کھوپڑی فضا میں معلق۔

کچھ ایسی ہی کیفیت سے میں دوچار تھا۔

”کیا تمہیں ہوش آگیا۔“ کرئل نے آہستہ سے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔“ میں نے جواب میں کہا۔ جسے سن کر ان کی بھونٹیں سکڑ گئی تھیں اور انہوں نے غصیلے لہجے میں کہا تھا۔

”جب چانگ نے حالات سے آگاہ کر دیا تھا تو جلدی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔“

”بس غلطی ہو گئی۔“

پھر میں نے چانگ کی آواز سنی جو کرئل کے پیچھے کھڑا کہہ رہا تھا۔ ”کیپٹن اگر آپ جلدی نہ کرتے تو ہم نے آج اس آدمی کو پکڑ ہی لیا تھا۔“

میں کچھ نہ بولا۔ بولتا بھی کیا۔ اگر اس سے یہ کہتا کہ تم نے پوری اسکیم نہیں بتائی تو وہ یہی سوچتا کہ کرئل فریدی کا اسٹنٹ جس کی اتنی شہرت ہے اتنی معمولی سی بات بھی نہ سمجھ سکا کہ وہ کیا چاہتا ہے۔ غالباً چانگ کی یہی اسکیم رہی ہوگی کہ کسی طرح اس بوڑھے یورپین کو پکڑ لیا جائے.... پھر میں سوچتا ہی رہ گیا ویسے میں اس وقت اسی عمارت میں تھا جس میں چانگ نے ٹھہرایا تھا۔

## چانگ کی کہانی

میں اٹھ کر بیٹھ گیا۔ حالانکہ ابھی یہی دل چاہ رہا تھا کہ پڑے رہو۔ کرئل نے بھی نہیں کہا کہ میں لیٹا ہی رہوں۔ وہ کسی گہری سوچ میں تھے اور چانگ مضطربانہ انداز میں کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے خود اسی سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔

دفعۃً اس نے کہا۔ ”کرئل غلطی میں نے ہی کی تھی۔ مگر میں کیا کرتا۔ میں نے سوچا کہ کہیں وہ کیپٹن کو ختم ہی نہ کر دیں۔“

”نہیں غلطی حمید کی ہے۔“ کرئل بولے۔ ”انہیں کلب سے اٹھنے میں اتنی جلدی کرنی ہی نہ چاہئے تھی۔“

”ارے تو کیا کیا میں نے۔“ میں نے پیشانی پر ہاتھ مار کر کہا۔ ”مجھ سے اتنی غلطی ضرور ہوئی ہے کہ زندہ بیٹھا ہوں۔ مگر یہ ایک بنیادی غلطی ہے جس کی ذمہ داری مجھ پر عائد نہیں ہو سکتی۔“

”تم لیٹ جاؤ.... اور تھوڑی دیر خاموش رہو۔“ کرئل نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔

میں لیٹ گیا.... اور کافی دیر تک خاموش رہنے کا ارادہ کر لیا کیونکہ بولا ہی نہیں جاتا تھا۔ زبان کی حرکت سر پر ہتھوڑے کی سی ضرب لگاتی تھی۔

”مگر اب کیا خیال ہے۔“ چانگ نے کہا۔ ”میرا دعویٰ ہے کہ بوڑھا یورپین وہی تھا جس کی مجھے تلاش ہے۔“

میرا دل چاہا کہ اس کے بیان کی تائید کروں لیکن پھر اس خیال سے خاموش رہا کہ ممکن ہے کرئل اسے پسند نہ کریں۔ میں اب کرئل کی طرف دیکھ رہا تھا کہ وہ چانگ کے جواب میں کیا کہتے ہیں۔

”تھک گیا ہوں۔“ میں نے لاپرواہی سے کہا۔

”اب آپ اپنی حالت میں کچھ بہتری محسوس کر رہے ہوں گے۔“  
”بہت زیادہ خراب حالت پہلے بھی نہیں تھی۔ مگر مسٹر چانگ کیا آپ لوگ میرے قریب ہی رہتے تھے۔“

”ہاں۔۔۔۔۔ مگر مجھے کمرل کی موجودگی کا علم نہیں تھا۔ جیسے ہی آپ کمرل کے قریب پہنچے۔  
قریب ہی دو آدمی موجود تھے جو مجھے دیکھتے ہی فرار ہو گئے۔ پھر بعد میں کمرل بھی آئے۔ ان سے  
معلوم ہوا کہ وہ بھی آپ کی نگرانی کر رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں نے جلد بازی سے  
کام لیا تھا ورنہ اس وقت کوئی کار آمد گواہ مل جاتا۔ شاید انہیں بھی بوڑھے کی سازش کا علم تھا اور وہ  
اسے اسی وقت گرفتار کرنا چاہتے تھے۔“

”لیکن آپ نے کہا تھا کہ وہ بوڑھا ان آدمیوں میں پہلی ہی بار نظر آیا ہے۔ تو کیا کئی آدمی  
پہلے ہی سے آپ کی نظروں میں رہے ہیں مسٹر چانگ۔“  
”یقیناً۔۔۔۔۔ لیکن وہ بوڑھا پہلی ہی بار نظر آیا تھا۔ ہاں کیپٹن اگر وہ ہال سے اٹھ کر ان لوگوں  
سے ملتا جو پہلے ہی سے میری نظر میں رہتے تھے تو شاید مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ وہ بھی انہیں  
میں سے ایک ہے۔“

میں نے اب بھی اسے اپنی اور سوفیا کی باتوں سے آگاہ نہیں کیا۔ کچھ دیر بعد میں نے کہا۔  
”کیا آپ نے میرے چہرے کے قریب آگ دیکھی تھی؟“  
”اوہ کیپٹن! یہی دیکھ کر تو میں گھبرا گیا تھا۔ میں سمجھا شاید وہ کوئی بے آواز آتش حزیب ہے۔  
مگر مجھے خوشی ہے کہ میں آپ کے چہرے پر تلے اور جھلنے کے آثار نہیں دیکھ رہا۔“  
”وہ آگ نہیں تھی مسٹر چانگ۔“

”ہائیں۔۔۔۔۔!“ چانگ حیرت سے منہ اور آنکھیں کھلا کر رہ گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اسے  
میری ذہنی حالت کے درست ہونے میں شبہ ہے۔  
”ہاں مسٹر چانگ وہ ہر فیملی باڈوں میں کڑکنے والی بکلی تھی۔“  
”میں نہیں سمجھا۔“

”پہلے تو مجھے ایسا معلوم ہوا تھا کہ جیسے میرا چہرہ جھلس گیا ہو۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن پھر میں

انہوں نے ایک طویل سانس لی اور پھر میرے چہرے پر نظر جمائے ہوئے بولے۔ ”ہاں  
مسٹر چانگ۔۔۔۔۔ یہ بھی ممکن ہے کیونکہ وہ گارساں کے ساتھیوں میں سے تھا اور گارساں ہی کی  
طرح غالباً اس کا بھی کوئی ریکارڈ نہ مل سکے اور میرا خیال ہے کہ وہ بھی گارساں ہی کی طرح میک  
اپ کا ماہر تھا۔۔۔۔۔ مگر۔۔۔۔۔!“

ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ کچھ کہنے والے ہوں۔ لیکن اب ارادہ ترک کر دیا ہو۔۔۔۔۔ میں اور  
چانگ سوالیہ انداز میں ان کی طرف دیکھتے رہے۔

”اچھا مسٹر چانگ اب میں واپس جاؤں گا۔ کیپٹن کی خبر گیری کے لئے بے حد شکر گزار  
ہوں۔“ انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

”ارے جناب۔۔۔۔۔ کمرل۔۔۔۔۔!“ چانگ نے جھپینے ہوئے انداز میں کہا۔ ”مجھے بے حد  
شرمندگی ہے کہ میری وجہ سے آپ لوگ تکلیف اٹھا رہے ہیں۔“  
”نہیں مسٹر چانگ۔۔۔۔۔ ایک ایسے بین الاقوامی مجرم نے ہماری سر زمین پر قدم رکھا ہے کہ  
ہم اطمینان سے بیٹھ ہی نہیں سکتے۔“

کمرل چلے گئے اور میں ان کے اس رویے کے متعلق سوچتا ہی رہا۔  
آخر وہ مجھے ایسی حالت میں یہاں کیوں چھوڑ گئے۔ اس سے پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔  
چانگ انہیں صدر دروازے تک چھوڑنے گیا تھا۔

کچھ دیر بعد وہ واپس آ گیا لیکن مجھ سے بھی زیادہ پریشان نظر آ رہا تھا۔ وہ میری مسہری کے  
قریب ہی ایک کرسی پر بیٹھ گیا اور پائپ میں کشیدنی افیون کی گولیاں خاموشی سے راکھ کر تا رہا۔  
حالانکہ اس کا دھواں مجھے گراں گذر رہا تھا لیکن میں خاموش ہی رہا۔ میں جانتا تھا کہ افیون بچے بغیر  
وہ خاموش ہی رہے گا اور اگر گفتگو کرنے پر مجبور بھی کیا گیا تو شاید اوٹ پانگ باتیں شروع کر دے۔  
ویسے بھی اس کی حالت سے یہی اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے بہت دیر سے افیون نہیں پی۔

آخر اس نے پائپ ایک طرف رکھ دیا اور چہرے پر رومال سے ہوا ڈینے لگا۔ اب وہ ادھ کھلی  
آنکھوں سے میری طرف بھی دیکھ رہا تھا۔ جو افیون کے نشے کے دباؤ سے ایسی ہو گئی تھیں۔

میں پھر بیٹھ گیا۔

”آپ“ لیتے ہی رہے تو بہتر ہے کیپٹن۔“ چانگ نے کہا۔

گارساں کی داستان کے لئے جاسوسی دنیا کے خاص نمبر ”خوفناک ہنگامہ“ جلد نمبر 8 ملاحظہ فرمائیے۔

بھی محسوس کرنے لگا تھا جیسے میرا سر برف کے برادے میں دفن کر دیا گیا ہو اور پھر وہ ٹھنڈک سارے جسم میں پھیل گئی تھی۔“

چانگ کی آنکھیں اب بھی پھیلی ہوئی تھیں۔ پھر اس وقت اس کی حیرت رفع ہوئی جب میں نے اس سے اصل معاملے کی بات شروع کی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کس آدمی کی تلاش میں ہے۔  
”کیا کرنل نے ابھی تک آپ سے تذکرہ نہیں کیا۔“  
”نہیں۔۔۔۔۔۔“

”جب تو کوئی خاص وجہ ہوگی تذکرہ نہ کرنے کی۔“  
”نہیں۔۔۔۔۔۔ کوئی خاص وجہ نہیں ہے۔ محض عادتاً وہ اپنے ماتحتوں کو کسی کیس کے دوران میں پوری طرح باخبر نہیں رکھتے۔“

”پھر میں ان سے پوچھ کر ہی آپ کو کچھ بتا سکوں گا۔ اس سے پہلے مجھے معاف رکھئے۔ میں آج تک کرنل کو نہ سمجھ سکا کہ وہ کس قسم کے آدمی ہیں۔“

”آپ کب اور کتنے دن تک ان کے ساتھ رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ مسٹر چانگ۔“  
”میں ان کے ساتھ کبھی نہیں رہا۔ ویسے اکثر وقتاً فوقتاً بعض بین الاقوامی نوعیت کے کیسوں کے سلسلے میں ان سے ملاقاتیں ہوتی رہی ہیں۔“

”مائی ڈیز مسٹر چانگ۔۔۔۔۔۔ میں سالہا سال سے ساتھ رہنے کے باوجود بھی انہیں آج تک نہیں سمجھ سکا۔ لہذا اس چکر میں نہ پڑیے ورنہ میں آپ کی کوئی مدد نہ کر سکوں گا۔ میں آج کل چھٹی پر ہوں۔ مطلب یہ کہ کرنل بھی مجھے اس پر مجبور نہ کر سکیں گے اور میں نے یہ بھی دیکھ لیا ہے کہ اس لڑکی کے پیٹ میں کتنی آنتیں ہیں۔“

”سچ!۔۔۔۔۔۔“ وہ دالہانہ انداز میں اٹھتا ہوا بولا۔  
”ہاں مسٹر چانگ اگر میں ایسا نہ ہوتا تو کرنل یہ کام میرے سپرد کیوں کرتے۔“

”ڈیز کیپٹن!۔۔۔۔۔۔“ وہ اپنے ہاتھ پھیلاتا ہوا بولا۔ ”آپ اس سے کچھ معلوم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔“

”بہت کچھ۔۔۔۔۔۔ لیکن میں اسی شرط پر بتا سکوں گا جب تم مجھے سارے حالات سے آگاہ کر دو۔“  
وہ کسی سوچ میں پڑ گیا۔۔۔۔۔۔ میں جانتا تھا کہ وہ آ۔ ائی سے نہیں بتائے گا کیونکہ اگر آسانی سے

بتانا ہی ہوتا تو پہلے ہی بتا چکا ہوتا۔ میں بہر حال اس کے لئے ایک کام انجام دینے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایسی صورت میں اسے خود ہی سارے حالات سے آگاہ کر دینا چاہئے تھا۔

”اس سے آپ نے کیا معلوم کیا ہے کیپٹن۔“ چانگ نے کچھ بتانے کی بجائے خود ہی سوال کیا۔  
”ناممکن مسٹر چانگ پہلے آپ۔“ میں نے اٹھ کر اپنا سوٹ کیس کھولا اور تمباکو کا نیا ڈبہ نکال کر مسمری پر آ بیٹھا۔ میرا پاپ نکلتے کے نیچے موجود تھا۔ کرنل جو کام بھی کرتے ہیں سلیقے سے کرتے ہیں۔ یعنی انہیں اتنا خیال تھا کہ میرے کپڑے تبدیل کراتے وقت انہوں نے کوٹ کی جیب سے پاپ بھی نکال کر نکلتے کے نیچے رکھ دیا تھا۔

”ہاں تو مسٹر چانگ۔“ میں نے تمباکو کے ڈبے کا کور کاٹتے ہوئے کہا۔ ”اب آپ براہ کرم اپنی کہانی شروع کر دیجئے اور اگر آپ اسے دہرانے میں تکلیف محسوس کر رہے ہوں تو میں یہی مشورہ دوں گا کہ دو چار گولیاں اور استعمال کر ڈالئے۔ پھر خدانے چاہا تو کسی قسم کی بھی ہچکچاہٹ نہیں محسوس کریں گے۔“

چانگ نے ایک معمولی سی ”ہو ہو“ کے بعد پاپ اٹھالیا اور اس میں ایک گولی ڈال کر دیا سلامتی دکھاتے ہوئے ایک ایسا لمبا کش لگایا کہ دوسرے کش کی نوبت آنے سے پہلے ہی گولی راکھ ہو گئی۔  
راکھ جھاڑ کر اس نے دوسری گولی سنبھال لی۔ اسی طرح پے در پے پانچ گولیاں راکھ کرنے کے بعد اس نے آگے پیچھے جھومتے ہوئے کہا۔

”کیپٹن میں وہ چانگ ہوں جس نے بہترے معرکے جھیلے ہیں۔ ہزاروں بار موت کے جبرؤں سے صحیح سلامت بچ نکلا ہوں۔ تم مجھے چین کا کرنل فریدی سمجھ سکتے ہو۔۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔۔ یعنی وہ چانگ مہینوں سے پریشان ہے۔ کیا تم نے کبھی گارساں کا نام سنا ہے۔“

”شاید ایک آدھ گولی زیادہ ہو گئی ہے مسٹر چانگ۔۔۔۔۔۔ ارے گارساں تو میرے قدموں میں پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا ایک دن۔“

”آہا۔۔۔۔۔۔!“ چانگ نے حیرت سے کہا۔ ”تو اس مہم میں آپ بھی شریک تھے۔“

میں نے اس غیر متعلق اور غیر ضروری سوال کا جواب نہیں دیا۔ میں تو بس اب یہی چاہتا تھا کہ وہ بے چوں و چرا مجھے اس کیس کے متعلق بتادے اور وہ شاید اب بتانے ہی لگا تھا۔ لیکن اس کی قیمت یہ تھی کہ میں بھی اسے اس گفتگو سے آگاہ کر دوں جو میرے اور سوفیا کے درمیان ہوئی



ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ پچھلی جنگ کے دوران میں گارساں کا وہ بمشکل ایک ملک کی سیکرٹ سروس والوں کے ہتھے چڑھ گیا تھا۔ اسے قیدی بنالیا گیا۔ پھر گارساں کرئل کے ہاتھوں اپنے انجام کو پہنچا۔ لیکن اس کا ہم شکل شاید اس ملک کی قید سے بھی بھاگتا تھا جس کی سیکرٹ سروس کے آدمیوں نے اسے گرفتار کیا تھا۔

”یہ کیسے معلوم ہوا کہ وہ نکل بھاگا۔“ میں نے پوچھا۔

”ہرگز نہیں۔۔۔۔۔!“ چانگ یک یک جوش سے بھر گیا۔ ”ہرگز نہیں۔ یہ ہو اس ہے۔ یہ محض پروپیگنڈا ہے کہ وہ نکل بھاگا۔ اگر وہ ایک دوسرے ملک میں نہ دیکھ لیا جاتا تو وہ ملک کبھی اس کا اعلان نہ کرتا کہ وہ نکل بھاگا ہے۔ آخر اس وقت کیوں اعلان کیا گیا جب وہ دوسری جگہ دیکھ لیا گیا تھا۔ اس سے صاف یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اس ملک کے لئے کام کرنا منظور کر لیا ہے۔“

”مگر اس کا نام کیا ہے۔“ میں نے پوچھا۔

”گارساں۔۔۔۔۔!“ چانگ نے جواب دیا۔ ”لیکن اصل نام تے ری فونگ ہے اور وہ حقیقتاً کوریا کا باشندہ ہے۔ گارساں تو فرج انڈوچائییز تھا۔“

”تے ری فونگ۔“ میں نے آہستہ سے دہرایا۔ میں یہ نام کرئل کی زبانی بارہا سن چکا تھا لیکن اس کے متعلق کسی حکومت کا کوئی اعلان میری نظروں سے نہیں گذرا تھا۔

”اچھا تو کیا وہ بوڑھا۔۔۔۔۔ فونگ ہی تھا۔“ میں نے پوچھا۔

”پتہ نہیں اودہ خود تھا یا اس کی پارٹی کا کوئی آدمی۔ میں وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔“

”مگر آپ کو یہ کیسے یقین ہو گیا کہ وہ فونگ ہی کی پارٹی ہو گی۔“

”دیکھئے کیپٹن دنیا میں معدودے چند آدمی ایسے نکلیں گے جنہوں نے گارساں یا فونگ کو ان کی اصلی شکل میں دیکھا ہو اور میں بھی انہی معدودے چند لوگوں میں سے ہوں۔ مجھے ذرا اصل شبہ ہے کہ یہ فونگ ہی کی پارٹی ہے اور فارموسا کی حکومت کا تختہ الٹنے کی سازش کر رہی ہے۔“

”آف فوہ۔۔۔۔۔ مسٹر چانگ۔۔۔۔۔ میرا خیال ہے کہ اب آپ پھر دو چار مزید گولیوں کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں، ارے میں معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آخر آپ کو شبہ کس بناء پر ہوا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ انسان بائی کی ڈانگ پارٹی ہو۔“

”شبہ کی وجہ وہ لڑکی ہے۔“

”میا مطلب۔۔۔۔۔!“ میں چونک پڑا۔

”کیا وہ ہر وقت کچھ خائف خائف سی نہیں رہتی ہے۔“

تھی۔ چانگ فارموسا کی سیکرٹ سروس کا چیف آفیسر تھا۔ لہذا میں نے سوچا کہ اسے الوننا بھی اپنی جگہ ایک مکمل آرٹ ہو گا۔

”اب اس نے کچھ دیر بعد کہا۔“ گارساں کی ٹولی اکثر چین کے خلاف بھی کام کیا کرتی تھی۔ مجھ سے کئی بار اس کی مدد بھیڑ ہوئی لیکن نہ میں اس پر قابو پا سکا اور نہ وہ مجھ پر۔ وہ ایک پراسرار آدمی تھا اور اس نے اپنا ایک پراسرار ہنر ابھی پیدا کیا تھا۔ وہ اسی کا ہم شکل تھا۔ مشہور ہے کہ عموماً اس کے ماتحت بھی دھوکہ کھا جایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ہم شکل کو بھی گارساں ہی سمجھتے تھے اور یہ بھی یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ کبھی انہوں نے دونوں کو اکٹھے دیکھا ہو۔ وہ تو ایک بار ایسا ہوا کہ دو جگہوں سے بیک وقت وہاں گارساں کی موجودگی کی اطلاع آئی۔ بس اسی سے اس کے ہم شکل کا راز ظاہر ہو گیا۔ قرینہ اس سے پہلے تو ہم لوگ یہ سمجھتے تھے کہ گارساں کوئی بری روح ہے جو پل بھر میں ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر سکتی ہے۔ مثلاً ابھی شکھائی سے یہ اطلاع آئی ہے کہ پولیس گارساں کا تعاقب کر رہی ہے۔ لیکن پینگ کے سرانگ رساں پینگ میں اس کی موجودگی پر مصر ہیں۔“

”میں بالکل نہیں سمجھا مسٹر چانگ۔“ میں نے سر ہلا کر کہا۔ ”ایک بار آپ کہتے ہیں کہ بیک وقت دو جگہوں پر اس کی موجودگی کی اطلاع اس کے ہم شکل کا راز ظاہر کر دیتی ہے اور دوسری بار آپ یہ کہتے ہیں کہ بیک وقت دو جگہوں پر اس کی موجودگی اسے کوئی بری روح ثابت کرتی تھی۔“

”اودہ آپ سمجھے نہیں۔ میں فاصلے کی بات کر رہا تھا۔ دیکھئے بات دراصل یہ ہے کہ اس وقت گولیاں معمول سے زیادہ ہو گئی ہیں۔ آپ کا خیال درست تھا ابی لئے میں اپنا مطلب واضح کرنے میں دشواری محسوس کر رہا ہوں۔ ہاں تو میں فاصلے کی بات کر رہا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ اگر آپ اسی وقت یہاں اور ہائی سرکل ٹائٹ کلب میں پائے جائیں تو میں یا تو اسے گپ سمجھوں گا یا آپ کو بھوت باور کر لوں گا۔ لیکن اگر آپ اسی عمارت کے دو مختلف کمروں میں بیک وقت پائے جائیں تو میں اگر اسے گپ بھی سمجھوں گا تو کم از کم اس کی تصدیق کرنا میرے لئے ممکن ہی ہو گا۔ آپ کو دونوں کمروں میں دیکھ لینے کے بعد ہی میں اس کا فیصلہ کر سکوں گا کہ آپ بھوت ہیں یا اپنا ہم شکل۔ کبھی نہ کہتے ہیں۔ وہ ایک ایسا ہی اتفاق تھا کہ دونوں ایک ہی عمارت میں اکٹھا ہو گئے تھے۔ یہ پینگ کے ایک ہوٹل کا واقعہ ہے۔ شاید گارساں یا اس کے ہم شکل کو ان کا علم نہیں تھا کہ دوسرا بھی وہاں موجود ہے۔ لہذا اس سے وہاں آنے کی غلطی سرزد ہو گئی۔۔۔۔۔ بہر حال۔۔۔۔۔!“



سے دیکھتا رہا ہوں کیپٹن۔ اگر وہ کبھی خوش بھی ہوتی ہے تو پھر تھوڑی دیر بعد اس طرح چونک کر خائف نظر آنے لگتی ہے جیسے اس سے کوئی غلطی سرزد ہو گئی ہو۔ یہی وجہ ہے کہ میں اسے فونگ ہی کی پارٹی سمجھنے پر مصر ہوں اور چونکہ فونگ فارموسا کیلئے خطرناک ثابت ہو سکتا ہے اس لئے اسے ٹھکانے لگادینا میرا فرض ہے۔“

میں کچھ نہ بولا۔ چانگ کی کہانی اکتادینے والی تھی اور چانگ مجھے خواہ مخواہ بور کر رہا تھا اس لئے اتنی بکواس کے باوجود بھی مجھے سچی بات نہیں بتائی تھی۔ اس کے دلائل کسی حد تک وزن ضرور رکھتے تھے۔ لیکن یہ بات میرے حلق سے نہیں اتر سکی کہ وہ اپنے بیان کردہ وجوہ کی بناء پر اسے فونگ کی پارٹی سمجھنے پر مجبور تھا۔ ان سب دلائل کی روشنی میں بھی میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ فونگ ہی کیوں؟ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور ہی کی پارٹی رہی ہو۔ مجھے یقین تھا کہ اسے فونگ کی پارٹی تسلیم کر لینے کی اصل وجہ چانگ چھپانا چاہتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس میں بھی کوئی مصلحت رہی ہو۔ کیوں کہ وہ ایک غیر ملک کا سرانگ رساں تھا اور ہمارے ملک کے محکمہ امور خارجہ کی اجازت سے ملک میں داخل ہوا تھا۔

میں یہی سب کچھ سوچتا رہا۔ چانگ نہ صرف خاموش ہو گیا تھا بلکہ شاید اب ضرورت سے زیادہ گولیاں اپنا اثر بھی دکھا رہی تھیں۔

چانگ اوگھ رہا تھا۔ میں نے سوچا چلو جان بچی۔ میں خواہ مخواہ جھوٹ بولنے سے بچ گیا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ میں اسے لڑکی کی وہ داستان تو ہرگز نہ سنا تا جو اس سے سنی تھی۔

میں تو اب اس ٹھنڈی آگ کے متعلق سوچ رہا تھا جس کی رگوں کو شل کر دینے والی کیفیت اب بھی کسی حد تک میرے اعصاب میں موجود تھی۔ وہ فونگ رہا ہو یا اور کوئی اب کرنل کے ہاتھوں سے اس کا بچنا محال ہی نظر آتا تھا۔

اچانک چانگ کو کھانسی آئی اور وہ چونک کر اس طرح چاروں طرف دیکھنے لگا جیسے یہاں اپنی موجودگی پر متحیر ہو۔

”میرا خیال ہے کہ رہتی ہے۔“

”اس پر فونگ ہی کی دہشت طاری رہتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ شریف اور بھولی بھالی لڑکی ہو اور وہ اسے کسی خاص مقصد کیلئے استعمال کر رہا ہو۔ فونگ کا طریق کار یہی ہے۔ وہ لڑکیوں کو ذہنی طور پر کچھ اس بُری طرح الجھا دیتا ہے کہ وہ اس کے پکر سے نکل ہی نہیں سکتیں۔“

”مائی ڈیئر.... مسٹر چانگ۔“ میں نے جھلا کر کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ وہ اختلاج قلب کی مریضہ ہو۔ اس لئے اس کا چہرہ ہر وقت انجانے خوف کا اظہار کرتا ہو۔ آخر وہ فونگ کے پکر میں پھنسی ہوئی کوئی لڑکی کیسے ہو سکتی ہے۔ یا ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور سے خائف ہو۔ آہ.... یہ تو کھلی ہوئی بات ہے کہ وہ کسی ایسے آدمی سے خائف ہے جس کے اچانک حملے سے بچنے کے لئے اس نے دو عدد ہاڈی گارڈز رکھ چھوڑے ہیں۔“

”اس نے رکھ چھوڑے ہیں۔“ چانگ نے حیرت سے کہا اور پھر یک بیک اس کی ”ہو ہو“ پھوٹ نکلی۔ پھر بدقت تمام وہ اس میں بریک لگا سکا۔

”اگر وہ ہاڈی گارڈز اس نے رکھے ہیں“ چانگ بولا۔ ”تو یہ کہنا پڑے گا کہ وہ اس سے بے حد بے تکلف ہیں۔ ورنہ اس کے سامنے بیٹھ کر شراب کیسے پیتے۔ آپ اتنی عقل بھی نہیں رکھتے کیپٹن۔ فرض کیجئے اس پر کسی آدمی کا خوف مسلط ہے تو وہ اپنے ہاڈی گارڈز کو ہر دقت باہوش رکھنے کی کوشش کرتی نہ کہ اس طرح شراب پینے کی اجازت دیتی۔ اس کا مطلب تو یہی ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اور کی طرف سے اس کے نگران مقرر کئے گئے ہیں اور ان کی نظروں میں لڑکی کا ذرہ برابر بھی احترام نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ لڑکی دوسروں پر یہی ظاہر کرتی ہو کہ وہ ایک اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ کیپٹن کاش تم گارساں اور اس کے کارناموں سے پوری طرح واقف ہوتے۔ یوں تو ساری دنیا میں اس کی بعض حرکتیں مشہور ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کی نجی زندگی کے متعلق بہت کم لوگوں کو کچھ معلوم ہو سکا ہے۔ گارساں جن ممالک کے لئے کام کرتا تھا ان میں تو اس کی حقیقت بڑی پردہ دار اور ذی عزت ہوتی تھی لیکن دوسرے ممالک میں وہ اکثر ڈاکوؤں اور چوروں کی سی زندگی بسر کرتا تھا۔ اس طرح وہ وہاں کے دوران قیام میں خاصی دولت اکٹھی کر لیتا تھا۔ خوبصورت لڑکیاں اس کے پاس ہوتیں اور وہ ان کے ذریعے دولت مند لوگوں کی جیبیں خالی کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ فونگ یعنی اس کے ہمزاد کو بھی اسی کے نقش قدم پر چلنا ہوا۔ میں یورپ کے کئی ملکوں میں اس لڑکی سو فیہا کا تعاقب کرتا رہا ہوں۔ اس نے وہاں کافی دھومیں مچائی ہیں اور ہر ملک میں اس کا نام مختلف رہا ہے۔ لیکن وہ ہمیشہ ہر جگہ خوفزدہ نظر آتی رہی ہے۔ میں اسے بہت غور

زیست بنا سکو۔“

میں نے عرض کیا تھا ”مے بھی تو کوئی ایسی... سونے کے مندر میں بٹھا کر دن رات پوجا کروں گا۔“

مجھے یاد نہیں کہ انہوں نے اس کا کیا جواب دیا تھا کیونکہ جیسا بھی جواب انہوں نے دیا ہو گا وہ میرے حافظے کے قابل ہی نہ رہا ہو گا۔

ہاں تو میں اس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ چانگ سے ملاقات ہونے سے پہلے ہی نکل چلو تو بہتر ہے۔ ورنہ وہ پھر اس لڑکی کے معاملے میں بور کرنا شروع کر دے گا اور سچی بات تو اس کے فرشتے بھی مجھ سے نہیں معلوم کر سکتے کیونکہ وہ بھی چینی ہی ہوں گے۔

میں نے بڑی تیزی سے لباس تبدیل کیا اور پھر کمرے سے نکل ہی رہا تھا کہ چانگ سے ملد بھیڑ ہو گئی۔

”خوب آلو بتایا تم نے پچھلی رات۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”آج کل الو بنانے کا میٹرل اتنا گراں آ رہا ہے کہ بنانے کو دل ہی نہیں چاہتا مسٹر چانگ۔“

کسی نے بے پر کی اڑائی ہو گی۔

”ہر گز نہیں... تم مجھے یہ قوف نہیں بنا سکتے۔“ چانگ نے کہا اور مجھے اس کا لہجہ بے حد گراں گذرا۔

”یہ بھی میری ہی مرضی پر منحصر ہے۔ بتاؤں یا نہ بتاؤں۔“ میں نے لاپرواہی سے کہا۔

چانگ کچھ دیر تک مجھے غصیلی نظروں سے دیکھتا رہا پھر بیک بیک مسکرا کر بولا۔ ”تم میرے چھوٹے بھائی ہو۔“

”ہو... ہو... ہو... ہو۔“ میں نے اسی کے سے انداز میں ہنسنے کی کوشش کی اور پھر آغیہ ہو کر بولا۔ ”خدا میرے گناہوں کو معاف کرے۔“

”باتوں میں نہ اڑاؤ“ چانگ نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”تم اس کی اہمیت سے ناواقف ہو۔ تم نہیں جانتے کہ میں کتنا پریشان ہوں۔ آخر اس لڑکی نے تمہیں کیا بتایا تھا۔“

”مائی ڈیر مسٹر چانگ...!“ میں نے اس کا ہاتھ بہ آہستگی اپنے شانے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔ ”میں صرف کرئل کو جوابدہ ہوں۔ میں نہیں جانتا کہ اس کیس سے آپ کا کیا تعلق ہے۔“

کرئل نے مجھے آپ کے ساتھ بھیجا ضرور تھا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں اپنی رپورٹ آپ کو دوں۔ آپ کو جو کچھ بھی معلوم کرنا ہے کرئل سے معلوم کر لیجئے گا۔“

## انغواء

رات کس طرح گزری میں نہیں بیان کر سکتا گا۔ کیونکہ چانگ کے جاتے ہی چند ایسے گدھے خرید کر سویا تھا جنہیں رینکا بھی نہیں آتا تھا۔ اس لئے اطمینان سے سوتا رہا۔ چانگ پر سچ مچ افیون چڑھ گئی تھی اور وہ اس لڑکی کی کہانی سے بغیر اٹھ کر چلا گیا تھا۔

صبح میں نے کسی قسم کی بھی کمزوری محسوس نہ کی۔ ذہن تروتازہ تھا، اور جسم میں اتنی چستی تھی کہ میں کسی گدھے کو بھی لات مار کر مغموم نہیں ہو سکتا تھا۔

”ہے... ہا...!“ ذل چاہا کہ بچوں کی طرح چیختا ہو اس کی پر ٹوٹ پڑوں۔ مگر اب وہاں چانگ کا وہ افیونی ملازم کہاں تھا جو ہر دو گھنٹے بعد یہ بھول جاتا تھا کہ کیشن حمید افیونی نہیں ہے۔

مجھے اس وقت وہ لڑکی یاد آرہی تھی۔ فونگ بھی آلو کا بیٹھا معلوم ہو رہا تھا اور چانگ بھی۔ وہ کتنی حسین تھی کتنی بھولی تھی۔ اس کی آواز میں کتنی کشش تھی اور جب وہ بیک اپنی گھنیری پلکیں اوپر اٹھاتی تھی تو کیا معلوم ہوتا تھا۔ ہائے کاش میں نے شاعری کی مشق جاری رکھی ہوتی... کاش میں نے... میرے خدا... یہ زندگی کتنی عجیب ہے۔ اس میں کتنے موڑ ہیں اور

ہر موڑ پر کیا کچھ نظر نہیں آتا۔ حیران ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں۔ مگر کانوں سے کچھ بھی سننا نہیں چاہتا۔ میں سوچتا ہوں کاش یہ خوبصورت لڑکیاں گو گئی ہوتیں۔ میں انہیں دیکھتا ہوں ان کے حسن سے مرعوب ہوتا ہوں کوئی یونان کی سائیکی معلوم ہوتی ہے اور کوئی مصر کی قلو پطرہ... لیکن جب یہ بولنا شروع کرتی ہیں تو خدا کی قسم ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان میں بھس

بھرا ہوا ہو۔ کاش ان کی رتوں میں بھی ویسے ہی خطوط اور زاویے ہوتے جیسے ان کے خدو خال میں پائے جاتے ہیں۔ کاش ان کے خیالات میں بھی وہی بالکین اور انیلا پن ہوتا جو ان کی سبک خرابی میں ملتا ہے۔ آنکھوں میں کتنا راس ہوتا ہے۔ کتنا نشیلا پن ہوتا ہے مگر زبانیں گھاس کاٹ کر

رکھ دیتی ہیں۔ ان کے ساتھ کھانے کو بیٹھ جاؤ تو متواتر چپ سٹائی دے گی جیسے کسی کتے کو میز پر بٹھالیا ہو۔ پانی پییں گی تو ”غٹ... غٹ... غٹ“ جیسے شیر کسی بھینس کی گردن دبوچ کر

اس کا خون پی رہا ہو۔ کبھی میں نہیں آتا کہاں ہر شیخ دوں۔ کون سا زہر کھا کر سوجاؤں کہ آئندہ یہ سب کچھ دیکھنے اور سننے میں نہ آئے۔ ایک بار کرئل سے اس ٹریجڈی کا تذکرہ آیا تھا۔ مسکرا کر

بولے تھے ”تمہیں کسی ایسی لڑکی کی تلاش ہے جسے فریم کرا کے ڈرائنگ روم کی کسی دیوار کی

میں آگے بڑھ گیا اور چانگ حیرت سے منہ کھولے کھڑا رہا۔

”سنئے کیپٹن... پلیز... صرف ایک بات۔“ میں نے اس کی غمگین آواز سنی اور آواز میں کچھ ایسا ہی درد تھا جیسے کسی کنوارے نے ایک محبت کرنے والی بیوہ کو ٹھکرا دیا ہو اور وہ عالمِ پاس میں اسے روکنے کی کوشش کر رہی ہو۔ یہ چینی بھی عجیب ہوتے ہیں آپ نہیں کہہ سکتے وہ کب اور کس بات پر غمگین ہو جائیں گے۔ لہذا کسی چینی کو اپنے بکرے کے جوان ہو جانے کی خبر بھی بہت محتاط ہو کر سنائیے انہیں ٹھیس نہ لگ جائے آگینوں کو۔

بہر حال میں نے بھی بسور کر پوچھا۔ ”کیا بات ہے۔“

”کیا آپ خفا ہو کر جا رہے ہیں۔“

”نہیں... میں پھر واپس آؤں گا۔“ میں نے کسی پردہ لیں جانے والے شوہر کی طرح دلا سے دیتے ہوئے کہا۔ مگر شاید پین کے شوہروں کا انداز الگ ہوتا ہو۔ ورنہ چانگ کی ہچکیاں بندھ جاتیں۔

وہ قریب آ گیا اور پھر آہستہ سے بولا۔ ”کیپٹن مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو ایک غلط بات پر مجبور کر رہا تھا۔ بلاشبہ آپ کرل ہی کو جواب دہ ہو سکتے ہیں۔“

”شکریہ...!“ میں نے کہا اور اتنی تیزی سے چل پڑا جیسے ملک الموت تعاقب میں ہو۔ میں اب بھی میک اپ ہی میں تھا۔ یہ پلاسٹک میک اپ تھا۔ بڑا تکلیف دہ ہوتا ہے اگر پورے چہرے کا ہو تو... آدمی دو گھنٹے سے زیادہ اسے برداشت نہیں کر سکتا۔ یہاں تو خیر خدا کا شکر ہے کہ صرف ناک اور گالوں کی ہڈیوں کے ابھار پر ہی کرل نے پلاسٹک کی تہہ بھائی تھی جس سے میری شکل میں اچھی خاصی تبدیلی ہو گئی تھی۔

میں نے باہر نکل کر سوچا اب کدھر جاؤں۔ سامنے والے مکان کی دیوار پر ”چل چل رہے نوجوان“ نامی فلم کا پوسٹر چپکا ہوا نظر آیا اور میں بڑی سعادت مندی سے چلنے لگا۔ مگر سوال یہ تھا کہ یہ چال کہیں تو ختم ہوگی ہی۔ پھر کیا وہیں دفن ہو جانا پڑے گا۔ یہ اسلئے سوچ رہا تھا کہ میرے پاس کام کا کوئی پروگرام نہیں تھا۔ کرل نے پچھلی رات یہ نہیں بتایا تھا کہ اب کیا کرنا ہوگا۔

لنکن میرے پاس ہی تھی۔ لیکن میں نے پیدل ہی اشارت لے لیا۔ قصد انہیں بلکہ یونہی بے خیالی میں کچھ دور چلنے کے بعد غلطی کا احساس ہوا۔ مگر پھر میں واپس نہیں لوٹا۔ میں نے سوچا آج پیدل ہی سہی۔ ایسے حالات میں یہی مناسب ہوتا ہے کہ پیدل ہی چلے ورنہ پیٹرول اتنی بے دردی سے پھٹکتا ہے کہ بعد میں خود بھی افسوس کرنے کو دل چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی منزل ہی نہ ہو

تو کیا ہوگا۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ اب کیا کرنا ہے۔ مگر مجھے پہلے ہی کیا کرنا تھا۔

اس بار پھر کرل نے مجھے چارے کے طور پر استعمال کیا تھا۔ پچھلی رات مجھلی پھنٹے پھنٹے رہ گئی تھی۔ چارے پر اس نے منہ مارا ہی تھا مگر چانگ جلدی کر گیا اور اب تو مجھلی بھڑک ہی گئی ہوگی۔ لہذا اب پھنٹے یا نہ پھنٹے... مگر وہ مجھلی کب تھی... وہ تو پھٹا تھا۔ جس کی فکر چانگ کو تھی۔ ممکن ہے کرل بھی پھٹا ہی کے چکر میں رہے ہوں۔ مگر وہ مجھلی... بام کی طرح چلیلی... اور جھینگے کی طرح شوخ اور غمزے والی... اور کیکڑے کی طرح کجروی کی عادی... اور روہو کی طرح... لا حول ولاقوۃ کہیں آپ یہ نہ سمجھ لیں کہ میں نے اس وقت مجھلی بازار جانے کا تہیہ کر لیا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ سوفیا کی خوبیوں کے لئے تشبیہات کا ذخیرہ کہاں سے لاؤں۔

یعنی مجھے اس کی پرہیزگار نہیں تھی کہ وہ کن حالات کی شکار ہے۔ میں تو اس کے لئے تشبیہات تلاش کر رہا تھا۔ مجھے اس سے کیا غرض کہ وہ مر رہی تھی تو یہ دیکھ رہا تھا کہ وہ جان کنی کے عالم میں کتنی حسین معلوم ہوتی ہے۔ چلے وہ مر بھی جاتی تو میں اس قسم کا کوئی شعر کہے بغیر نہ رہتا۔

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں

خاک میں کیا صورتیں ہوں گی جو پنہا ہو گئیں

کچھ بھی ہو سوفیا ایسی ہی لڑکی تھی جس کے بارے میں بہت کچھ سوچا جاسکتا تھا۔ اس لئے اگر میں نے جان ہی دینے کی ٹھان لی تھی تو کیا برا کیا تھا۔ مگر ٹھہریے میں اتنا چغہ بھی نہیں ہوں کہ کسی لڑکی کے لئے جان دے دوں۔ پھر ایسی صورت میں جب کہ پچھلی رات مجھ پر حملہ ہو چکا تھا۔ میرے قدم آرکچھو کی طرف کیوں اٹھ رہے تھے۔ اوہو کیا آپ بھول گئے کہ میں اس کیس میں چارے کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا۔ کیا کرل جو مجھے پچھلی رات اتنی لاپرواہی سے چانگ کے گھر میں چھوڑ کر چلے گئے تھے اس وقت قیلولہ کر رہے ہوں گے۔ نوپ! اگر وہ حقیقتاً خود سو بھی رہے ہوں گے تو انہوں نے میرے گرد کم از کم اپنی بلیک فورس کا جال ضرور پھیلا دیا ہوگا۔ یہ بلیک فورس بھی آج تک میری سمجھ میں نہ آسکی اگر اس کا تعلق مجھے سے ہوتا تو یہ بلیک فورس کیوں کہلاتی۔ میرا خیال ہے کہ میرے علاوہ اور کسی کو اس کا علم نہیں تھا۔ ایک یہی نہیں کرل کے ہزاروں راز مجھ سے پوشیدہ ہیں۔ بعض اوقات تو میں سنجیدگی سے سوچنے لگتا ہوں کہ یہ حضرت عموماً جس شکل میں نظر آتے ہیں یہ ان کی اصل شکل ہے بھی یا نہیں۔

آر لکچو پہنچ کر میں سیدھا روم نمبر تھرٹین کی طرف چلا گیا۔ دروازے پر آہستہ سے دستک دی۔ کسی کے چلنے کی آواز آئی اور دروازہ کھلا۔

سوفیا شب خوابی کے لباس میں سامنے کھڑی تھی۔ لیکن پھر وہ بوکھلا کر بستر کی طرف بھاگی اور جلدی سے اپنے اوپر سلیپنگ گاؤن ڈال لیا۔ وہ بے حد خوفزدہ نظر آنے لگی تھی۔

”جاؤ پرسن خدا کے لئے جاؤ۔۔۔۔۔ پتہ نہیں وہ کیا کر بیٹھے۔“ اس نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

”میرے معاملے میں وہ خود کشی کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتا۔“

”میں کہتی ہوں جاؤ۔۔۔۔۔ خدا کے لئے۔“ وہ مجھے دھکیلتی ہوئی بولی۔

”نہیں میں تمہیں اپنے ساتھ لے چلوں گا۔“

”میں مرنا نہیں چاہتی۔۔۔۔۔ جاؤ چلے جاؤ۔“

میں اسے ایک طرف ہٹا کر کمرے میں داخل ہو گیا۔ لیکن ٹھیک اسی وقت دونوں انڈو چائینیئر باڈی گارڈز بھی اندر گھس آئے۔ دروازہ بند کر دیا گیا۔ ان کے ارادے نیک نہیں معلوم ہوتے تھے۔ شاید انہوں نے ارادہ کیا تھا کہ میرا گلا گھونٹ کر مار ڈالیں کیونکہ وہ خالی ہاتھ اس طرف میری طرف بڑھ رہے تھے جیسے میں ان کی نظروں میں ایک حقیر ترین کیزار ہا ہوں۔ مجھے ان کے اس انداز پر بڑا غصہ آیا۔ میں نے غلط اندازہ نہیں لگایا تھا۔ وہ مجھ پر ایک ساتھ حملہ کرنے والے تھے۔ لیکن میں نے انہیں اس کا موقع نہیں دیا۔ دوسرے ہی لمحے میں نے ریوالور نکال لیا۔ ”پیچھے ہٹو“

وہ جہاں تھے وہیں رک گئے۔ میں نے کہا۔ ”تم لوگ تین گھنٹے کے اندر شہر خالی کر دو ورنہ

ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑا جائے گا۔ یہاں پرسن واراب کے علاوہ کسی اور کی گنجائش نہیں اور یہ

لڑکی مجھے اتنی پسند آئی ہے کہ یہ زندگی بھر میرے ساتھ رہ سکتی ہے۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہو گا۔“

وہ دونوں خاموش کھڑے رہے پھر میں نے ایک کو مخاطب کر کے دوسرے کے لئے کہا۔

”اس کے ہاتھ اور پیر باندھ دو۔“ وہ اپنی جگہ سے ہلا بھی نہیں میں نے پھر کہا۔ میں اس ریوالور کو

استعمال بھی کر سکتا ہوں کیونکہ یہ قطعی بے آواز ہے۔ تم دونوں نہایت اطمینان سے سو جاؤ گے۔

لڑکی تم یہاں سے چلنے کی تیاری کرو۔ اگر تم نے بھی میرا حکم نہ مانا تو میں تمہاری لاش بھی یہیں

چھوڑ جاؤں گا۔“

وہ کچھ نہ بولی۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ اپنی سلیپنگ گاؤن کی ڈوری اس آدمی کے حوالے

کر دے جسے میں دوسرے کو باندھنے کا حکم دے چکا تھا۔ سوفیا نے ڈوری اس کی طرف اچھال دی

اور وہ اپنے دوسرے ساتھی کے ہاتھ پشت پر باندھنے لگا۔ دوسرا آہستہ آہستہ کچھ کہہ رہا تھا۔ جسے

میں نہ سمجھ سکا۔ لیکن میں نے سوفیا کے چہرے پر تشویش کے آثار دیکھے۔ اب میں بھی اتنا احمق نہیں تھا کہ اس گفتگو کا مقصد نہ سمجھتا۔

”اگر تم نے اس کے ہاتھ ڈھیلے باندھے تو وہی پھندا تمہارے لئے پھانسی کا پھندا بن جائے گا۔“ میں نے آہستہ سے کہا۔

ایک بیک سوفیا بہت مستعد نظر آنے لگی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ابھی تک سوتی رہی ہو۔

اس نے جلدی جلدی اپنا سوٹ کیس کھول کر اس میں سے ریشم کی ڈور نکالی اور اسے میری طرف

بڑھا دیا۔ لیکن کچھ بولی نہیں۔ جب ایک باڈی گارڈ دوسرے کو باندھ چکا تو میں نے اُس سے کہا کہ

وہ بھی خاموشی سے اپنے ہاتھ پیر بندھوا لے مگر وہ کینچوا تو تھا نہیں۔ اس نے برجستہ کہا کہ اگر تم

میرے ہاتھ پیر باندھ سکے تو بلاشبہ بندھوا لوں گا۔ اس پر میں نے سوفیا سے کہا کہ وہ اس کی جامہ

تلاشی لے۔ سوفیا کے ہاتھ پیر کانپ رہے تھے لیکن اس نے دیر نہیں لگائی۔ باڈی گارڈ کی جیب

سے ایک بڑا سا چاقو برآمد ہوا۔ چاقو اپنے قبضے میں کر لینے کے بعد میں سوچنے لگا کہ اسے کس

طرح باندھا جائے۔

سوفیا اس کام کے لئے بھی ناموزوں ہوتی کہ ریوالور ہی لئے کھڑی رہے۔ اتنے میں فون کی

گھنٹی بجی اور میں نے ریسیور اٹھالیا۔ ریوالور کارخ باڈی گارڈ ہی کی طرف تھا۔ میں نے ریسیور اٹھالیا

تو مگر سوفیا کی طرف بڑھا دیا۔

سوفیا نے کال ریسیور کی۔

”آپ کے لئے ہے۔“ اس نے کہا اور ریسیور مجھے دے دیا۔

دوسری طرف سے کرٹل کی آواز آئی اور میں بوکھلا گیا۔ انہوں نے کہا۔ ”تم وہاں کیا

کر رہے ہو۔“

”ایک کو باندھ چکا ہوں اب دوسرے کی فکر ہے۔“

”باڈی گارڈز۔“

”جی ہاں۔“

”پھر۔۔۔۔۔!“

”لڑکی میرے ساتھ جائے گی۔“

”کہاں جائے گی۔“

”جہاں آپ کہئے۔“



”میرا خیال ہے کہ تم وقت برباد کر رہے ہو۔“

”نہیں وقت اچھا کئے گا۔ میرا خیال ہے کہ وہ شاعرانہ ذوق رکھتی ہے۔“

”خیر.... فی الحال تم اسے جھریالی کا علاقہ دکھلاؤ.... اس کے بعد اسی عمارت میں اسے لے

جانا جہاں جاگت رہتا ہے.... بس۔“

دوسری طرف سے سلسلہ منقطع کر دیا گیا۔ لیکن میری حیرت کا کیا ٹھکانہ۔ آخر میں اسے جھریالی کی طرف کیوں لے جاتا۔ وہ سنسان میدانوں اور جنگلوں کا علاقہ تھا۔ ریسور رکھتے وقت مجھ سے ایک غلطی ہوئی جس کے لئے مجھے بھگتنا پڑا۔ بس اتنی غلطی ہوئی تھی کہ میری توجہ باڑی گارڈ سے ہٹ کر فون کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ اس نے مجھ پر چھلانگ لگائی اور ریوالور میرے ہاتھ سے نکل گیا۔

لیکن میں فوراً ہی سنبھل گیا ورنہ شاید میں نیچے ہوتا۔

انڈو چائنیز لپٹ پڑا تھا۔ لیکن شاید شریفوں سے لڑنے کا سلیقہ اسے نہیں تھا۔ کیونکہ مجھے ایسا ہی محسوس ہو رہا تھا جیسے کوئی بندر مجھ سے لپٹ پڑا ہو۔ سب سے پہلے اس نے میرے داہنے بازو پر منہ مارا اور میں بلبلاتا ہوا۔ پھر میرے چہرے پر ناخنوں سے نقش و نگار بنانے کی کوشش کی جس پر بڑا مان کر میں نے بھی ایک گھونٹہ عرض کر دیا جسے اس نے اپنی ناک پر ریسور کر کے کچھ کہا اور دوسری طرف الٹ گیا۔ جو کچھ بھی کہا تھا اپنی مادری زبان میں کہا تھا۔ لیکن میں پوری زبان کے علاوہ ایسے مواقع پر دنیا کی ساری زبانیں بھول جاتا ہوں۔ ورنہ خدشہ رہتا ہے کہ کہیں چھٹی کا دودھ یاد نہ آجائے۔ جیسے ہی وہ فرش پر گر امیں نے یہی مناسب سمجھا کہ اس پر کم از کم دو چار مرتبہ قدم رنجہ ہی فرماؤں۔ چنانچہ میں دو تین بار اس کے سینے پر اچھلا اور نیچے اتر آیا۔ اب یہ مادری زبان میں اس قدم رنجہ فرمائی کہ شکریہ ادا کرنا ہوا اور اس کا دوسرا ساتھی انگریزی میں جو کچھ کہہ رہا تھا اگر اردو میں کہتا تو میں اس کا سر قلم کر دیتا۔

بہر حال قدم رنجہ فرمانے سے بھی کچھ نہ ہوا۔۔۔ شکریہ ادا کر کے وہ اٹھ ہی رہا تھا کہ میں نے اس کی کھوپڑی کو قدم سینٹ لڑوم سے شرفیاب کرنا شروع کر دیا۔ اب اس میں شکریہ ادا کرنے کی بھی سکت نہیں رہ گئی تھی۔ اس نے عالم سرور میں اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس سے مطمئن ہونے کے بعد میں اس کے ساتھی کی طرف متوجہ ہوا۔ جس کے ہاتھ پیر بندھے ہوئے تھے لیکن زبان قینچی کی طرح چل رہی تھی۔ لیکن میرے پاس قینچی نہیں تھی ورنہ.... بہر حال اب وہ میری شان میں قصیدہ خوانی کے سلسلے میں مبالغے کی سرحدیں چھوئے لگا تھا۔ اس لئے میں

نے یہی مناسب سمجھا کہ اب اس کی زبان کو آرام کرنا چاہئے۔

میرا رومال ناکافی ہوا تو مجھے سوفیا سے ایک رومال اُدھا لینا پڑا۔ کیا اب یہ بھی بتاؤں کہ اس نے اس وقت میری سات پشتوں تک کا شکریہ ادا کر کے رکھ دیا تھا۔ جب میں اس کے منہ میں رومال ٹھونس رہا تھا۔

لڑکی اس دوران میں ایک چھوٹا سا سوٹ کیس سنبھالتی رہی تھی۔ کبھی کبھی اس کے حلق سے ڈری ڈری سی آوازیں بھی نکل جاتی تھیں۔

وہ میرے ساتھ جانے پر تیار ہو گئی تھی لیکن اس طرح خائف نظر آرہی تھی جیسے باہر نکلے ہی اُسے کوئی گولی مار دے گا۔ میں نہایت اطمینان سے نکلا چلا آیا۔ دونوں باڑی گارڈز کو اسی کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ باہر آکر میں نے نیکی کی اور ہم جھریالی کی طرف روانہ ہو گئے۔ لڑکی پیچھے مڑ کر دیکھے جارہی تھی شاید اسے تعاقب کا خدشہ تھا۔ خدشہ تو مجھے بھی تھا لیکن میں مطمئن بھی تھا کہ بقیہ معاملات کر ٹل خود ہی سمجھ بوجھ لیں گے۔ ظاہر ہے کہ انہیں اس کا بھی علم تھا کہ میں سوفیا کے کمرے میں داخل ہوا ہوں۔ نہ صرف علم تھا بلکہ یقین بھی رکھتے تھے کہ میں وہاں ہر قسم کے حالات پر قابو پاؤں گا۔ مجھے حیرت بھی تھی کہ آخر وہ مجھ پر اتنا اعتماد کیوں کرنے لگے ہیں۔

”اب ہم کہاں جائیں گے۔“ سوفیا نے خوفزدہ آواز میں کہا۔

”اب ہم تھوڑی سی تفریح کریں گے۔ کیونکہ ابھی تک ہم کو فٹ کا سامنا کرتے رہے ہیں۔“

”کیا میں یقین کر لوں کہ اب میرا مستقبل محفوظ رہے گا۔“

”مستقبل کبھی محفوظ نہیں رہتا ہے۔ پہلے وہ حال بنتا ہے اور پھر ماضی میں تبدیل ہو جاتا ہے

اور ہم بوڑھے ہو جاتے ہیں۔ لہذا مستقبل کی فکر فضول ہے۔“

”میں نے تم پر اعتماد کر لیا ہے۔“

”بڑا نہیں کیا۔“ میرا مختصر سا جواب تھا۔

میں دراصل الجھن میں پڑ گیا تھا۔ آخر جھریالی کا ویران علاقہ کیوں اور پھر اس کے بعد جاگت کے مکان میں واپسی۔ وہ مکان تو بقول جاگت پہلے ہی سے ان لوگوں کی نظروں میں تھا۔

بہر حال جو کچھ بھی مجھ سے کہا گیا تھا بے چوں و چرا کرنا تھا۔

”تم خاموش کیوں ہو۔“ سوفیا نے کہا۔ وہ بہت زیادہ مضطرب معلوم ہو رہی تھی۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ تمہارے چچا کا کیا حال ہو گا۔ کیا اس نے اپنی زندگی کا بیہ کر لیا تھا۔“

”وہ جہنم میں جائے۔“ سوفیا بڑا سامنے بنا کر بولی۔ ”اس کے تصور سے بھی نفرت معلوم ہوتی ہے۔“

”کیا اس کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی ہیں۔“  
”میں ان دونوں محافظوں کے علاوہ اور کسی سے واقف نہیں۔“

”اسے ہمیشہ ہی تہاد دیکھا ہے۔۔۔۔؟“

”ہاں۔۔۔۔ ہمیشہ۔۔۔۔ حد یہ ہے کہ کبھی کسی سے گفتگو کرتے بھی نہیں دیکھا۔ اگر کبھی کوئی اجنبی اسے مخاطب بھی کرتا ہے تو وہ اتنی سرد مہری سے پیش آتا ہے کہ دوسری باز اس کی ہمت نہیں پڑتی۔“

”وہ خود کہاں مقیم ہے۔“

”مجھے اس کا بھی علم نہیں۔“

”پھر کیسے کام چلے گا۔“ میں نے مایوسانہ انداز میں کہا۔

”اوہ۔۔۔۔ تو تم اس کے خلاف کیا کرنا چاہتے ہو۔“

”ہو سکا تو قتل کروں گا۔“ میں نے لاپرواہی سے کہا اور اسے لرزتے دیکھا۔

”نہیں۔۔۔۔!“ اس نے اپنے ہونٹوں پر زبان پھیر کر کہا۔ ”اس کی کیا ضرورت ہے۔“

”پھر تم اس کے سلسلے میں کیا چاہتی ہو۔“

”بس اتنا ہی کہ آئندہ اس کا سامنا نہ ہو۔“

میں اس طرح خاموش ہو گیا جیسے سچ سوچ رہا ہوں کہ اُسے مار ڈالا جائے یا زندہ رکھا جائے۔  
ٹیکسی ڈرائیور سمجھا تھا شاید ہم لوگ سیاح ہیں اس لئے اکثر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر جھریالی کے علاقے کے متعلق کچھ کہنے لگتا تھا۔ ٹیکسی شہر سے نکل کر ایک ویران راستے پر لگ گئی تھی۔  
”یہ تم کہاں لے جا رہے ہو۔“ سو فیانے کہا۔ اب پھر اس کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔  
”ادھر ایک بڑی خوبصورت جھیل ہے۔ میں آج پھر دیکھوں گا کہ وہ تمہاری آنکھوں سے زیادہ گہری تو نہیں ہے۔“

”میرے خدا۔“ وہ ٹھنڈی سانس لے کر بوڑائی۔ ”کیا اب میں ریگستان سے نکل کر کسی دلدل میں پھنسون گی۔“

میں کچھ نہ بولا۔ میرا خیال تھا کہ ایسے کسی موقع پر زبان کو تھکانا میسود ہوتا ہے۔ میری دانست میں چونکہ وہ خود ہی غیر یقینی حالات کی شکار تھی اس لئے محض الفاظ سے اس کی تسکین ناممکن تھی۔

دفعۃً میں نے پیچھے کسی وزنی گاڑی کی آواز سنی۔ مڑ کر دیکھا۔ وہ ایک ٹرک تھا جس پر بانس

لدے ہوئے تھے۔ میں پھر مطمئن ہو گیا۔

ابھی تک تو مجھے تعاقب کے آثار نہیں نظر آئے تھے۔

ٹرک کی رفتار تیز تھی وہ ٹیکسی کے برابر سے آگے نکل گیا۔ لیکن اس کی رفتار اتنی تیز بھی نہیں تھی کہ ٹیکسی سے اس کا فاصلہ بہت زیادہ ہو جاتا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے ٹیکسی آگے نکالی چاہی لیکن میں نے اُسے روک دیا۔ بالکل ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے وہ ٹرک ہماری راہ میں حاصل ہی رہتا چاہتا ہو۔ میں الجھن میں پڑ گیا۔ پیچھے سڑک اب سنسان پڑی تھی۔ مگر ٹرک کی رفتار میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔ ہماری ٹیکسی بھی پہلے ہی کی سی رفتار سے جا رہی تھی۔

جھیل تک یہی کیفیت رہی۔ پھر جیسے ہی ہم جھیل کے قریب پہنچے ٹرک نے ایک لمبا چکر لیا اور پھر شہر ہی کی جانب مڑ گیا۔ کیا یہ کم حیرت انگیز تھا کہ وہ قریب کی فیکٹری میں بانس اتارے بغیر واپس ہو گیا تھا۔ خیموں کے لئے بانس بنانے کی ایک فیکٹری اسی علاقے میں تھی۔

## واپسی

کرئل نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں سو فیانے کو جھریالی کے علاقے کی طرف لے جاؤں اور پھر وہاں سے ہماری واپسی چانگ کے مکان پر ہو۔ لیکن یہ نہیں بتایا تھا کہ جھریالی کے علاقے میں ہماری مدت قیام کیا ہوگی۔

ڈرائیور نے میرے اشارے پر ٹیکسی جھیل کے کنارے پر روک دی۔

سو فیانے چاروں طرف دیکھ کر ایک طویل سانس لی اور اس وقت نہ جانے کیوں مجھے رائیڈر ہیگرڈ کا ناول ”شی“ یاد آ رہا تھا۔ جس میں ایک ایسی حسینہ کا تذکرہ ہے جو ہزاروں سال سے زندہ تھی اور جو الاکھی کی آگ میں نہا کر جوان ہو جایا کرتی تھی اور ہمیشہ جوان ہی رہتی تھی۔

”یہ جادو کی جھیل ہے۔“ میں نے سو فیانے سے کہا۔ ”تم نے پُر اسرار مشرق کے متعلق اپنے

یہاں لاتعداد استانیں سنی ہوں گی۔ میں دراصل اسی جھیل میں رہتا ہوں۔“

”نہیں۔۔۔۔!“ سو فیانے بیک مجھے گھورنے لگی۔

”ہاں۔۔۔۔ میں ہزار سال سے زندہ ہوں۔۔۔۔ میری رعایا مجھے ”ہی“ کہتی ہے اور ”ہوا“ کہہ

کر مخاطب کرتی ہے۔ میں ہزار سال سے اپنی رعایا پر حکمران ہوں۔ جب بوڑھا ہونے لگتا ہوں تو

اسی جھیل کا پانی اپنی دم پر لگا کر دوبارہ جوان ہو جاتا ہوں۔“  
سوفیا کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی۔ ”میں نے رائیڈر ہیکرڈ کا ناول شی پڑھا ہے۔ وہ ہیا۔۔۔

کہلاتی تھی۔۔۔ اور تم ”ہی“ ہو۔۔۔ مگر ”ہوا“ کسے کہتے ہیں۔“

میں نے اسے ”ہوا“ کا مطلب سمجھانے کی کوشش کی اور وہ زیادہ ہنسنے لگی۔

”نوزائیدہ ہیکرڈ نے ”ہوا“ سے ”ہیا“ بنائی ہے۔ لوگ اس سے اسی طرح خائف رہتے تھے جیسے تمہارے بتائے ہوئے ”ہوا“ سے ہو سکتے ہیں۔ تم بہت دلچسپ اور ذہین آدمی معلوم ہوتے ہو پر نس۔۔۔ میرے خدا میں آج کتنے دنوں بعد دل کھول کر ہنسی ہوں۔“

پھر وہ کار کا دروازہ کھول کر نیچے اتر گئی۔ میں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ وہ کسی ننھی سی بچی کی طرح خوش نظر آنے لگی تھی۔

”میں پیرس سے کبھی باہر نہیں نکلی۔ اس کے بعد نکلی بھی تو ایسے حالات کا شکار رہی۔

یورپ کے مختلف شہروں ہی میں ماری ماری پھری ہوں، ایسے مناظر میری نظروں سے کم گزرے ہیں۔ اودہ پر نس اودہ پر نس۔۔۔ میں کتنی خوش نصیب ہوں کاش ساری زندگی مطمئن رہوں۔ کاش

موجودہ حالات کی بھی اصلیت ظاہر ہو جائے۔“

”سب کچھ ہو جائے گا۔“ میں نے کہا۔ ”مگر تمہیں اپنی زبان کھولنی پڑے گی۔ اس کے بغیر کچھ بھی نہ ہو سکے گا۔ تم مجھے بتاؤ کہ اپنے اس بچا کے متعلق اور کیا جانتی ہو۔“

”میں اس کے علاوہ اور کچھ نہیں جانتی جتنا بتا چکی ہوں اور دونوں باڈی گارڈز کے علاوہ کسی

ایسے تیسرے آدمی کے وجود سے بھی ناواقف ہوں جو میرے بچا سے تعلق رکھتا ہو۔ لیکن

ٹھہرو۔۔۔ میں تمہیں ایک اہم واقعہ بتاؤں گی۔ جو ایسٹرمڈم میں پیش آیا تھا۔ میں اپنی اس قید و بند

کی زندگی سے اکتا گئی تھی۔ ایک شام میں اپنے باڈی گارڈز کے ساتھ ایسٹرمڈم کی ایک تفریح گاہ

میں بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے اپنی بے بسی پر ہزار ونا آیا۔ لیکن میں نے تہیہ کر لیا کہ اب ان لوگوں کی

ایک نہ سنوں گی۔ میرا بچا بھی اسی تفریح گاہ میں موجود تھا حسب معمول مقررہ وقت پر وہ جانے

کے لئے اٹھ گیا اور مجھے بھی اٹھنے کا اشارہ کیا۔ باڈی گارڈز بھی اٹھے۔ لیکن میں نے اٹھنے سے انکار

کر دیا۔ میں نے کہا کہ میں اب ان پابندیوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ اگر زبردستی کی گئی تو میں یہیں

شور مچانا شروع کر دوں گی اور تم سب مصیبت میں پڑ جاؤ گے۔ وہ دونوں گھبرا گئے اور ان میں سے

ایک نے کہا اچھا ٹھہرو میں تمہارے بچا سے اجازت لے آؤں پھر تم بیٹھ سکو گی۔ ہمیں کوئی

اعتراض نہ ہو گا۔ ایک وہیں موجود رہا اور دوسرا چلا گیا۔ مجھے سچ بڑا شدید غصہ آ گیا تھا اور آئندہ

لمحات کے بہتر یا بدتر ہونے کا دار و مدار صرف میرے بچا کے جواب پر تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ حالات کا مقابلہ سختی سے کروں گی۔ تھوڑی دیر بعد باڈی گارڈز نے آکر اطلاع دی کہ میرا بچا بھی مجھے باہر باغ میں بلارہا ہے۔ میں اٹھ گئی۔ میں اب براہ راست اسی سے گفتگو کرنا چاہتی تھی۔ باڈی گارڈز میرے ساتھ چلتے رہے اور میں باغ کے اس گوشے میں پہنچ گئی جہاں میرا بچا پہلے سے موجود تھا۔

اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کیا چاہتی ہوں اور میں کسی جوالا مکھی کی طرح پھٹ پڑی۔ اس گوشے میں ہم چاروں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا اور میں فرانسیسی میں گفتگو کر رہی تھی۔ یہاں روشنی بھی نہیں تھی۔ بس تاروں کی چھاؤں میں ان تینوں کی دھندھلی سی پرچھائیاں دکھ سکتی تھی۔ وہ تین کیا اگر تین ہزار ہوتے تب بھی میری زبان نہیں رک سکتی تھی۔ جو کچھ میرا جی چاہتا کہتی رہی۔ اچانک کوئی کٹنگنی سی چیز میرے چہرے سے ٹکرائی پھر آنکھوں کے سامنے بجلی سی چمکی اور مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا چہرہ جھلس گیا ہو۔ لیکن کیا وہ آگ تھی۔“

وہ خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگی۔ اس کی پیشانی پر شکنیں تھیں اور آنکھوں سے کسی تکلیف کا اظہار ہو رہا تھا۔ میں کچھ نہ بولا۔ اس نے پھر کہا۔ ”کاش تمہیں اس پر یقین آجائے۔ کاش! اسے تم گپ نہ سمجھو کیونکہ تم ابھی ابھی رائیڈر ہیکرڈ کے ایک ناول کا حوالہ دے چکے ہو۔ میں نہیں کہہ سکتی کہ تم نے اس کا تذکرہ کیوں چھیڑا تھا۔ ہو سکتا ہے تم سرے ہی سے میری اس داستان کو گپ سمجھتے ہو اور تمہارا خیال ہو کہ میں کوئی آوارہ لڑکی ہوں اور اسی طرح مالدار آدمیوں کو پھانسا میرا پیشہ ہو۔ تم کچھ بھی سمجھو میرا کچھ بھی حشر ہو مگر اب میں ان حالات کے جال سے نکلنا چاہتی ہوں، خواہ مجھے اس جھیل کی تہہ میں کیوں نہ پناہ لینا پڑے۔“

”تم بیان جاری رکھو میں تمہاری کہانی کو غلط نہیں سمجھا کیونکہ میں اکثر خود بھی اس سے کہیں زیادہ پراسرار حالات سے دوچار ہو چکا ہوں اور انہیں حالات کے پیش نظر میں تم میں اتنی دلچسپی بھی لے رہا ہوں ورنہ پر نس داراب ولد مہاراجہ سرخاب بہت مشغول آدمی ہے۔“

”پہلے مجھے ایسا محسوس ہوا تھا“ اس نے کہانی دوبارہ شروع کی اور پھر خاموش ہو کر اپنی پیشانی رگڑنے لگی۔ میں بھی خاموش ہی رہا۔ اسے ٹوکنا نہیں چاہتا تھا۔

”مجھے ایسا محسوس ہوا تھا۔۔۔ اودہ مجھے وہ تکلیف اس وقت یاد آگئی ہے پر نس مجھے پہلا ایسا محسوس ہوا تھا جیسے میرا چہرہ جھلس گیا ہو۔ لیکن پھر آہستہ آہستہ یہ محسوس کرنے لگی جیسے میرے شانوں پر سر کی بجائے برف کی چٹان رکھ دی گئی ہو۔ پھر میرا سارا جسم برف کے ڈھیر میں دب کر



وہاں پہنچ کر مجھے پھر متحیر ہونا پڑا۔ میرے ایک ماتحت نے بتایا کہ کرنل نے فون پر ہدایت دی ہے جیسے ہی وہاں پہنچوں ساتھی سمیت مجھے گھر چلے آنے کو کہا جائے۔  
ٹیکسی میں نے چھوڑ دی تھی۔ اب لیکن نکالنی پڑی لیکن روانگی سے پہلے میں نے کرنل کو فون کر کے اپنے ماتحت کے بیان کی تصدیق کر لی تھی۔ وہ گھر ہی پر موجود تھے اور ان کی خواہش تھی کہ میں سوفیا سمیت وہیں پہنچاؤں۔

سوفیا خاموش ہی تھی۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے اس نے خود کو میرے رحم و کرم پر چھوڑ دیا ہو۔ ہم کو ٹیکسی کی طرف روانہ ہو گئے۔

”تمہاری یہ گاڑی بڑی شاندار ہے۔“ سوفیا نے کہا۔

”تم یہ کیوں بھول جاتی ہو کہ میں شہزادہ ہوں۔ یہ گاڑی ایئر کنڈیشنڈ ہے۔“

میں اب بھی میک اپ ہی میں تھا اگر اپنی گاڑی میں نہ آیا ہوتا تو ملازم مجھ پر خونخوار قسم کے کتے چھوڑ دیتے۔ کیونکہ میں درانہ اندر گھستا چلا گیا تھا۔ نصیرانے ٹوکا تھا۔ مگر میں نے آواز بدلے بغیر اسے ڈانٹ دیا تھا۔ ورنہ بات ضرور بڑھ جاتی۔

کرنل لاہوری میں تنہا نہیں تھے ان کے ساتھ چانگ بھی تھا، اور میز پر بہت سے کاغذات بکھرے ہوئے تھے۔ ان کاغذات کے ساتھ چمڑے کا مخصوص طرز کا تھیلا دیکھ کر میں نے اندازہ لگا لیا کہ دفتر کے ریکارڈ روم سے کسی پرانے کیس کے کاغذات نکالے گئے ہیں۔ سوفیا کو میرے ساتھ دیکھ کر چانگ کا منہ حیرت سے کھل گیا اور کرنل نے مجھے بتایا کہ چانگ کو میرے اس کارنامے کا علم نہیں تھا۔

اس نے دبی زبان سے اتنا ضرور کہا کہ میں نے شاید اچھا نہیں کیا۔ یہ لڑی بھی فراڈ ہو سکتی ہے۔ اس پر سوفیا نے بہت بُرا سامنہ بنایا اور اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک آئے۔ چانگ چونکہ ہم سے انگریزی میں گفتگو کرتا تھا اس لئے سوفیا کو اس کے خیالات کا علم ہو گیا۔ ورنہ شاید میں یہی کوشش کرتا کہ اس کی دل چسپی نہ ہونے پائے۔

”اسے نیلم کے سپرد کر کے یہاں واپس آ جاؤ۔“ کرنل نے مجھ سے کہا۔

نیلم اس وقت کوٹھی ہی میں موجود تھی۔ اس نے کافی دیر تک میرا مصحکہ اڑایا۔ مجھے بابا کہتی رہی اور سوفیا کو ”بابی“ کہہ کر مخاطب کرتی رہی۔ پھر وہ اسے اپنے ساتھ اپنے رہائشی بکروں کی طرف لیتی چلی گئی۔

میں پھر لاہوری کی طرف واپس آیا۔ کرنل نے شاید کاغذات سمیت کر تھیلے میں بھر دیے

رہ گیا ہو۔ میں بیہوش ہو گئی۔ پھر میں نہیں جانتی کہ کتنی دیر بعد مجھے ہوش آیا تھا۔ میں ایک تنگ و تاریک کوٹھری میں بند تھی اور میرے سر پر وہی دونوں ہاڈی گارڈز مسلط تھے۔ ان کا خیال تھا کہ بوڑھا مجھے مار ڈالے گا۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ وہ بھی اس سے خائف رہتے ہیں۔ کیونکہ اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ وہ بے حد چالاک اور طاقتور ہے۔ پھر انہوں نے مجھے سمجھانا شروع کیا کہ میں مفت میں عیش کر رہی ہوں۔ مجھے ابھی تک کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ مجھے کسی ناجائز اور غیر قانونی کام پر مجبور نہیں کیا گیا۔ پھر آخر بدحواسی کی کیا ضرورت ہے۔ میں نے بھی سوچا کہ اب بے چوں و چرا وہی کرنا چاہئے جو یہ لوگ کہیں۔ پھر جب کبھی گلو خلاصی کی صورت نظر آئے تو پھر ہاتھ پیر مارے جائیں گے۔ میں تنہا ان لوگوں سے سننے کی قوت نہیں رکھتی تھی۔ ان دونوں نے مجھے دھمکی بھی دی تھی کہ اگر میں آسانی سے راہ پر نہ آئی تو وہ مجھے شریف اور نیک نہ رہنے دیں گے۔ پھر میں راہ پر آ گئی۔ پھر اس خبیث اور پراسرار آدمی کے اشاروں پر تاپنے لگی۔ مگر میں آج تک نہ سمجھ سکی کہ میرا مصرف کیا ہے۔ نہ مجھے آج تک کسی سے ملنے پر مجبور کیا گیا نہ کسی سے گفتگو کرنے کو کہا گیا۔ یہاں آنے کے لئے بھی وہ ایک بہانہ تھا ورنہ میں آپ کو کچھیلی رات ہی بتا چکی ہوں ہوں کہ مرنے والا ایک فلاش آدمی تھا۔

”تو اب تم ان لوگوں میں واپس جانا چاہتیں۔“

”اس پر میں موت کو ترجیح دوں گی۔ اس کے علاوہ اور سب کچھ کر سکتی ہوں۔ میں اب عیش پر تھوکتا بھی پسند نہیں کرتی۔“

”اچھا تو آؤ واپس چلیں۔۔۔ اب تم ان لوگوں میں واپس نہیں جاؤ گی۔“

”میں زندگی بھر احسان مند رہوں گی اگر ان سے چھٹکارا نصیب ہو جائے۔“

”چلو۔۔۔!“ میں ٹیکسی کی طرف مڑ گیا۔ خواہ وہ ایک شاندار فریب ہی کیوں نہ رہا ہو لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں اس لڑکی کی بیچارگی سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ مجھے وہ لڑکی یاد آئی جو حقیقتاً ایک ملک کی شہزادی تھی مگر چند اجنبیوں کے ہاتھوں ایسے پراسرار حالات کا شکار ہوئی تھی کہ اس کے پاگل ہونے میں کوئی کسر نہیں رہ گئی تھی۔ پہلے میں اسے بھی فراڈ ہی سمجھا تھا لیکن پھر مجھے اپنی بدگمانی پر بے حد افسوس ہوا تھا۔

ہم دونوں ٹیکسی میں بیٹھ گئے اور وہ پھر شہر کی طرف چل پڑی۔ میں راستے بھر ہوشیار رہا۔ لیکن چانگ کے مکان تک پہنچنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

اس داستان کے لئے جاسوسی دنیا کے ناول ”خون کا دریا“ جلد نمبر 7 ملاحظہ فرمائیے۔



”نہیں....!“ چانگ پر مسرت انداز میں چونک پڑا۔  
 ”میں جانتا ہوں کہ اس کا قیام کہاں ہے۔ میں نے پچھلی رات ہی معلوم کر لیا تھا۔“  
 ”ضروری نہیں ہے کہ وہ اب بھی وہیں ہو۔“ چانگ نے مایوسانہ انداز میں سر ہلا کر کہا۔  
 ”مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے چند ساتھیوں سمیت اب بھی اسی مکان میں موجود ہے۔ میں ایسے مواقع پر غافل رہنے کا عادی نہیں ہوں۔“

”تب پھر آپ دیر کیوں کر رہے ہیں۔“ چانگ بولا۔  
 ”بس اب دیر نہیں کروں گا۔“ کرٹل مسکرائے۔ ”مجھے کیپٹن حمید کے اسی کارنامے کا انتظار تھا۔“

ایک سردی لہر میرے جسم میں دوڑ گئی۔ کرٹل کی مسکراہٹ ایسی ہی تھی میں نہیں سمجھ سکا کہ ان کے لہجے میں کیا تھا۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ میرے لئے جو کچھ انہوں نے کہا تھا وہ طعنے تھا یا حقیقت میں ان کی نظروں میں کوئی کارنامہ انجام دیا تھا۔

چانگ جواب طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کرٹل نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ اب اس میک اپ کی ضرورت نہیں رہی اسے ختم کر دو۔ مسٹر چانگ بھی خواہ میک اپ میں میرے ساتھ چلیں خواہ اپنی شکل میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ کیونکہ میں آج گار ساں کے ساتھی تھے ری فونگ کو پکڑ ہی لوں گا۔

”نہیں میں میک اپ ہی میں رہنا مناسب سمجھوں گا۔“ چانگ نے کہا۔  
 ”تمہاری مرضی۔“ کرٹل بولے اور کاغذات کا تھیلا میز کی دراز میں رکھتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”جاؤ جلدی کرو۔ اب اس میک اپ کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم اسی وقت وہاں جائیں گے جہاں فونگ مقیم ہے۔“

میں لائبریری سے لیبارٹری کی طرف روانہ ہو گیا۔

## کچھڑ کارومان

چانگ نے اس پر بڑی حیرت ظاہر کی کہ ہمارے ساتھ پولیس کی جمعیت نہیں تھی۔ صرف میں اور کرٹل اس مہم کو سر کرنے کے لئے چل پڑے تھے۔ ہمارا تو یہی حال تھا لیکن دوسرے اس

تھے۔ تھیلا اب بھی میز ہی پر موجود تھا۔

میں نے کرٹل کو لڑکی کی داستان سنائی اور چانگ کی ”ہو ہو“ اشارت ہو گئی۔ میرا دل چاہا کہ الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کر دوں مگر پھر تاؤ کھا کر رہ گیا۔ اگر مجھے اس کا خیال نہ ہوتا کہ وہ کرٹل کا دوست ہے تو میں بلا تکلف ایک آدھ ہاتھ جھاڑ دیتا۔ اس کے ہنسنے کا انداز ایسا تھا جیسے میں آلو بن گیا ہوں یا میں نے جو کچھ بھی کہا ہے جھوٹ کہا ہے۔

کرٹل نے میرے بیان پر تبصرہ نہیں کیا۔ البتہ چانگ سے بولے ”فی الحال تو یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ لڑکی جی ہے یا جھوٹی۔ اس کی تصدیق ہم اسی وقت کر سکیں گے جب فونگ ہاتھ آجائے۔“

”مگر وہ سو رکچہ ہاتھ ہی کیوں آنے لگا۔“ چانگ نے ناخوشگوار لہجے میں کہا۔ ”ویسے میرا دعویٰ ہے کہ فونگ بھی یہی چاہتا ہے کہ یہ لڑکی آپ کے مکان میں پہنچ جائے۔ ورنہ اسے دن دہارے کون نکال لا سکتا تھا۔“

”تو پھر اس کا یہ مطلب ہے کہ میں میک اپ میں بھی پہچان لیا گیا ہوں گا۔“ میں نے کہا۔  
 ”اس کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اسے لکھ لہجے کہ فونگ ہی کے ایماء پر یہ لڑکی آپ کے ساتھ آئی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ لڑکی حقائق سے لاعلم ہو۔“

میں خاموش ہو گیا۔ اب چانگ کے اس خیال میں کسی حد تک وزن نظر آنے لگا تھا پچھلی رات مجھے بیہوش کیا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے میں پہچان لیا گیا ہوں۔ پھر سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مجھے وہ ٹرک یاد آیا جس میں بانس بھرے ہوئے تھے۔ لیکن وہ خیمہ ساز فیکٹری میں خالی کئے بغیر پھر شہر کی طرف موڑ دیا گیا تھا۔ ہو سکتا ہے اس میں فونگ ہی کے آدمی رہے ہوں اور یہ بھی ممکن ہے کہ چانگ کے گھر سے کوٹھی تک بھی میرا تعاقب کیا گیا ہو۔ شہر میں جہاں ٹریفک کی ریل پیل رہتی ہے تعاقب کا اندازہ کرنا دشوار ہو جاتا ہے اور پھر میں نے تو خاص طور پر اس پر دھیان بھی نہیں دیا تھا۔ چانگ کے گھر سے یہاں آتے وقت میں صرف سوفیا کے متعلق سوچتا رہا تھا۔ اسے ذہن میں رکھتے بغیر کہ وہ کس طرح مجھ تک پہنچی تھی کیوں پہنچی تھی۔ چانگ بڑبڑاتا رہا۔ کرٹل کچھ سوچتے رہے اور میں بور ہو تارہا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ بہت زیادہ بور نہیں ہوا کیونکہ چانگ کی ”ہو ہو“ اس وقت نہیں چل رہی تھی۔

”دفعہ کرٹل بولے۔“ اچھا چانگ اگر وہ بوڑھا پور وین ہی فونگ ہے تو اسے میری حراست میں تصور کرو۔“

”مگر آپ نے تو کہا تھا کہ میں یہ قصہ اسی وقت ختم کر دوں گا۔“

”ہو سکتا ہے ختم ہی ہو جائے۔“

اس پر میں خود بھی جھنجھلا گیا۔ پتہ نہیں چاگ کا کیا حال ہوا تھا۔ بس کرئل ایسے ہی مواقع پر کھلے لگتے ہیں جب ان کی طرف سے کسی بات کا کوئی صاف جواب نہیں ملتا۔

”اس سے پوچھ گچھ کرنے کے لئے میں ہی کافی تھا۔ آپ کیوں تکلیف کر رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔

لیکن کرئل نے جواب نہیں دیا۔ کارشہر سے نکل آئی تھی۔

”کیا وہ شہر میں نہیں رہتا۔“ میں نے پوچھا۔

جواب نفی میں ملا۔ لیکن یہ نہیں بتایا کہ جانا کہاں ہے۔ دیے سڑک تو وہی تھی جو جھریالی کی طرف جاتی ہے۔ چاگ کبھی کبھی استفہامیہ نظروں سے میری طرف دیکھنے لگتا تھا۔ ہم دونوں بچھلی نشست پر تھے اور کرئل ڈرائیو کر رہے تھے۔

میرا دل چاہا کہ قوالی شروع کر دوں مگر چونکہ کرئل کے ساتھ تھا اس لئے تیس مارخانی کے مواقع نہیں نصیب ہو سکتے تھے۔ تیس مارخانی مجھ سے عموماً اس وقت سرزد ہوتی ہے جب میں تنہا ہوتا ہوں۔ اگر کوئی ٹوکنے والا سر پر موجود ہو تو عقل اپنی حدود سے باہر نہیں ہونے پاتی۔

کار ایک کچے راستے پر موڑ دی گئی۔ پتہ نہیں منزل کہاں تھی۔ میری دانست میں تو ادھر کوئی ایسی عمارت ہو ہی نہیں سکتی تھی جہاں کوئی غیر ملکی شبہات سے بالاتر ہو کر قیام کر سکتا مگر پھر مجھے یاد آیا کہ جھریالی کے قرب وجوار میں چینی کے برتن بنانے کا بھی ایک کارخانہ ہے اور اس کے آس پاس تھوڑی سی آبادی بھی پائی جاتی ہے۔ وہ کارخانہ ایک غیر ملکی فرم کے تحت چل رہا تھا اس لئے اس کی نواحی بستی میں غیر ملکیتوں کا قیام شہے کی نظر سے نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔

میرا اندازہ غلط نہیں تھا۔ کار اسی بستی کی ایک چھوٹی سی عمارت کے سامنے روکی گئی۔ عمارت خوبصورت تھی اور پائیں باغ مختصر سا مگر سلیقے کا تھا۔ کرئل کار سے اتر کر سیدھے عمارت کی طرف بڑھتے چلے گئے میں اور چاگ بھی بڑھے۔ دیے آپ یقین کیجئے کہ میں بڑی بے دلی سے چل رہا تھا۔ میں چونکہ اپنے کیس کے ڈرامائی اختتام کا عادی تھا اس لئے مجھے کوفت سی ہو رہی تھی اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہی بوڑھا فونگ ثابت ہو تو بات کیا بنے گی کرئل اسے اسی طرح گرفتار کر لیں گے جیسے مجرم عام طور پر گرفتار کر لئے جاتے ہیں۔ کرئل کے ساتھ کام کرنے کا لطف دراصل اسی میں تھا کہ کیس کے اختتام پر کسی ٹپٹے سے ناول کا مزہ آجائے۔ وہ بڑے داؤ بیچ کے

پر یقین کرنے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ دیے اس سلسلے میں کرئل کا کوئی اصول نہیں تھا۔ اکثر وہ تنہا ہی ایسی مہموں پر روانہ ہو جاتے تھے اور اکثر ایسا ہوتا کہ یا تو ان کی بلیک فورس کے آدمی ان کے آس پاس موجود ہوتے تھے یا ان کے بعض ماتحت۔

بہر حال اس وقت کی روانگی عجیب لگ رہی تھی۔ بس ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے چند خوشباش قسم کے آدمی کہیں خالی ہاتھ بیٹھے گفتگو کر رہے ہوں اور گفتگو کے دوران ہرن کے شکار کا تذکرہ چھڑ گیا ہو اور انہیں میں سے ایک صاحب نے اٹھ کر کہا ہو۔ چلو ہرن مار لائیں۔ اس وقت دل چاہ رہا ہے کہ آپ کو ہرن کے شکار کا ایک لطیفہ سناؤں۔ مگر ٹالے ورنہ آپ اور میرے تذکرہ نویس صاحب دونوں ہی کہیں گے کہ سپنس کا خون کر دیا۔ ویسے ہم کسی نہ کسی کا خون کرنے تو جا ہی رہے تھے۔ ظاہر ہے مجرموں کی گرفتاری کے سلسلے میں اکثر گولیاں بھی چلتی رہیں اور وہ گولیاں لگنے ہی کے لئے چلتی ہیں ان کا مقصد سلام و دعا یا مزاج پرسی نہیں ہوتا۔

”کرئل کہیں آپ غلطی تو نہیں کر رہے۔“ چاگ نے کہا۔ ”اے اچھی طرح سوچ لیجئے کہ گارساں اور فونگ کے درمیان اس کا فیصلہ نہیں ہو سکا تھا کہ کون کس سے زیادہ خطرناک ہے۔“

”پھر تم کیا چاہتے ہو۔“

”اس طرح تنہا جانا ٹھیک نہیں ہے۔“

”تنہا.... ارے ہم تین ہیں چاگ۔“

”وہ تو ٹھیک ہے.... مگر....!“

”ہاں.... آں.... میں سمجھتا ہوں۔“ کرئل کچھ سوچتے ہوئے بولے۔ ”لیکن میں اس پر ابھی

تک یقین نہیں کر سکا کہ وہ فونگ ہی ہو گا۔ کیوں چاگ کیا تمہارے پاس اس کی کوئی پہچان ہے۔“

”سوائے اس کے اور کوئی نہیں کہ میں اسے اس کی اصلی شکل میں دیکھ سکوں۔“

”میک اپ میں بھی اسے نہیں پہچان سکتے۔“ کرئل نے پوچھا۔

”ہرگز نہیں.... میں ایک انہونی بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔“

”اسی لئے میں نے ضروری نہیں سمجھا کہ اس سلسلے میں قبل از وقت شور مچایا جائے اور میں عموماً ضابطے کے اندر ہی رہ کر کسی قسم کی کاروائی کرتا ہوں۔ اگر وہ لڑکی میرے ہاتھ نہ آگئی ہوتی تو میں اتنی جلدی نہ کرتا۔ فی الحال میں اس لڑکی کی شکایت پر بوڑھے سے پوچھ گچھ کیلئے جا رہا ہوں۔“

”صرف پوچھ گچھ....!“ چاگ نے مایوسانہ انداز میں پوچھا۔

”پھر اور کیا.... ابھی اس سے زیادہ تو کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔“

”کرتی ہوگی۔“ اس نے لاپرواہی سے شانوں کو جنبش دی۔

”میرا شو کس برآمدے میں رکھا ہوا ہے ذرا ادھر چلنے کی تکلیف گوارا فرمائیے۔“

”او تم دفع ہو جاؤ یہاں سے۔“ اس نے بندروں کی طرح دانت نکالے۔ ”ورنہ میں ابھی اپنا خونخوار بلڈ ہاؤنڈ تم پر چھوڑ دوں گا۔“

پھر وہ بیٹھ گیا اور ایک کیاری کی مینڈ کاٹ کر اس کا زائید پانی دوسری کیاری میں منتقل کرنے لگا۔

میں نے کہا۔ ”اگر تم سیدھی طرح نہیں چلو گے تو میں تمہیں زبردستی لے چلوں گا۔“

”اچھا....!“ وہ سر اٹھا کر مجھے تیکھی نظروں سے دیکھنے لگا اس کے دونوں ہاتھ بدستور پانی میں تھے۔ دفعتاً میں بوکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔ کیونکہ غیر متوقع طور پر بہت سا کچڑ میرے چہرے کی طرف اچھال دیا گیا تھا۔ مگر اب پیچھے ہٹنے سے کیا ہوتا تھا۔ کچڑ تو پڑ ہی چکا تھا چہرے پر اور میری آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ میں نے بیباختہ اس کے والدین کا شکریہ ادا کرنا شروع کر دیا اور پھر مجھے اس زور کا غصہ آیا کہ آنکھیں کھولے بغیر ہی اس پر چھلانگ لگا دی اور ”چھپاک“ کی آواز کے ساتھ ہی میرا غصہ حیرت انگیز طور پر خوش مزاجی میں تبدیل ہو گیا کیونکہ میں پانی سے بھری ہوئی کسی کیاری میں گرا تھا۔ پھر آپ جانتے ہی ہیں کہ کسی دلدل میں گر کر جلدی سے اٹھ بیٹھنا کتنا مشکل کام ہے۔ دانتوں پر بھی دلدل کا کچھ نہ کچھ اثر ہوتا ہی ہے۔ ورنہ میں کہتا کہ دانتوں پسینہ آجاتا ہے.... خیر ہاں.... آپ ہنس رہے ہوں گے۔ خدا کرے ہمیشہ اسی طرح ہستے رہیں کیونکہ میرا غصہ بھی بالکل ہی کافور ہو گیا تھا۔

میں نے بدقت تمام آنکھیں کھولیں ان میں مریچیں سی بھر گئی تھیں۔ عمارت کا عقبی دروازہ بند نظر آیا۔ دروازہ بند ہونے کی آواز تو میں نے کیاری میں گرنے کے بعد ہی سنی تھی۔ تو گویا وہ بوڑھا اس وقت کسی پاگل اور جھکی آدمی کا رول ادا کر رہا تھا ورنہ اس طرح بھاگ کر دروازہ کیوں بند کر لیتا۔

میں وہیں کھڑا اپنے چہرے اور بالوں سے کچڑ جھٹکتا رہا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کرل کرل کرل کے سامنے کیسے جاؤں۔ یقیناً ماننے اس خیال پر سچ مجھ پر بوکھلاہٹ طاری ہو گئی اور میں نے دوڑ کر دروازہ پینا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی اندر سے بوڑھے کے قہقہے کی آوازیں آنے لگیں۔ وہ بچوں کی طرح ہنس رہا تھا۔

”بھاگ جاؤ.... بھاگ جاؤ۔“ اس نے کہا۔ ”اب کبھی اپنی شکل نہ دکھانا۔ میں انشور نش

ساتھ مجرموں پر ہاتھ ڈالتے تھے۔ اس انداز میں کہ مجرم بھی ہکا بکا رہ جاتے تھے۔

میرا دعویٰ ہے کہ ایسے مواقع پر اگر مجرموں کی ذہنی رو بہک جائے تو وہ خود بھی اسی انداز میں تالیاں بجانے لگیں جیسے کسی فلم میں چونی والے ہیرو کی اس وقت کی اچانک آمد پر تالیاں بجانے لگتے ہیں جب ویلین ہیروئن پر دست درازیاں کر رہا ہو۔ مگر میں سوچ رہا تھا کہ مجھے شاید تالیاں بجانے کا موقع نہ مل سکے کیونکہ میں چانگ سے متفق تھا۔ میرا یہی خیال تھا کہ وہ یوروپین بوڑھا نوٹنگ ہی ہوگا۔

کرل برآمدے میں پہنچ کر کال بل کا مٹن دبا رہے تھے ہم بھی پہنچ گئے۔ لیکن دو منٹ گذر جانے کے باوجود بھی دروازہ نہ کھلا۔

کرل ہماری طرف مڑے۔ ان کے چہرے پر تشویش کے آثار تھے۔

چانگ نے آہستہ سے کہا۔ ”کرل.... فونگ سے مقابلہ ہے۔ اگر وہ فونگ کا کوئی ساتھی ہوگا تب بھی آسانی سے آپ اس پر ہاتھ نہ ڈال سکیں گے۔“

کرل نے اس کے اس خیال پر اپنی رائے نہیں ظاہر کی۔ وہ چند لمحے کچھ سوچتے رہے پھر بولے اندر کوئی نہ کوئی موجود ضرور ہے لیکن وہ یا تو بہرہ ہے یا سو رہا ہے یا سر گیا ہے کیونکہ دروازہ اندر ہی سے بند ہے۔

”ہو سکتا ہے عقبی دروازے میں قفل پڑا ہو۔“ میں نے خیال ظاہر کیا۔

”چلو اسے بھی دیکھ لیتے ہیں۔ مگر نہیں.... ہم یہیں تمہارا انتظار کریں گے۔“

میں برآمدے سے نیچے اتر آیا اور عمارت کی پشت کی طرف چل پڑا۔ عمارت گو چھوٹی تھی لیکن چہار دیواری کا پھیلاؤ پشت پر بہت زیادہ تھا اور یہاں مختلف قسم کی ترکاریوں کے چھوٹے چھوٹے کھیت تھے۔ انہیں کھیتوں کے درمیان مجھے ایک آدمی نظر آیا لیکن وہ آدمی ایسا ہی تھا کہ جیب میں پڑے ہوئے رپوالور پر میری گرفت مضبوط ہو گئی۔

غالباً آپ سمجھ گئے ہوں گے۔ سوفیا کے چچا کو پہلی ہی نظر میں پہچان لینا میرے لئے مشکل کام نہیں تھا۔ میں نے عمارت کی طرف دیکھا جس کا عقبی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یہ بوڑھا غالباً اندر ہی سے کھیتوں کی طرف آتا تھا۔ میں اس کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

”کیا بات ہے۔“ اس نے چڑچڑے پن کا مظاہرہ کیا۔

”اوہ میں گو بھی اور شلجم کے بیج فروخت کرتا ہوں مطلب یہ کہ ایک ایسی فرم کا نمائندہ

ہوں جو گو بھی اور شلجم اور چتندرو وغیرہ کے بیج فروخت کرتی ہے۔“



ایجنٹوں سے اسی طرح پیش آتا ہوں۔“

پھر وہ خاموش ہو کر بڑبڑایا۔ ”اب اُدھر کون سور کا بچہ ہے۔“

میں نے گھٹنی بجنے کی بھی آواز سنی تھی۔ ممکن ہے کرئل نے اندر سے قہقہے کی آواز سن کر پھر گھٹنی کا بٹن دبایا ہو۔ پھر میں نے قدموں کی آواز سنی۔ شاید وہ صدر دروازے کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے دروازے کی جھری سے جھانکنا۔ میرا خیال غلط نہیں تھا وہ اسی جانب جا رہا تھا۔ میں نے اسے ایک دروازہ میں داخل ہوتے دیکھا پھر وہ نظر نہیں آیا۔

میں سوچنے لگا کہ اب مجھے کیا کرنا چاہئے۔ چانگ مجھے اس حال میں دیکھ کر اپنی ”ہو ہو“ اشارت کر دیتا اور میرا یہی دل چاہتا کہ یا تو اُسے ”ہو ہو“ کے قابل ہی نہ رہنے دوں یا اپنا ہی لگا گھونٹ لوں۔ ویسے یہ دونوں ہی صورتیں ناممکن تھیں۔

اگر بوڑھے نے حقیقتاً مجھے کوئی انشورنس ایجنٹ ہی سمجھا تھا تو یقیناً وہ میری اصلیت سے ناواقف تھا۔ جب وہ میری اصلیت سے ہی ناواقف تھا تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ پچھلی رات میک اپ میں ہونے کے باوجود بھی میں کیپٹن حمید ہی کی حیثیت سے نشانہ بنایا گیا تھا۔ مگر اس وقت یہ سب کچھ سوچنے کا موقع نہیں تھا۔ اندر سے پھر کسی قسم کی آواز نہیں آئی۔ لیکن آنکھ میری بدستور جھری سے لگی رہی۔ شاید اسی حالت میں پانچ منٹ گزر گئے۔

اچانک میں نے کرئل کو دیکھا جو اندرونی برآمدے میں کھڑے چاروں طرف دیکھ رہے تھے۔

لیکن میں انہیں آواز دینے سے پہلے ہی اچھل پڑا۔ کسی نے میری پشت پر ہاتھ مارا تھا۔

دوسرے ہی لمحے میں چانگ پر نظر پڑی جو حیرت سے آنکھیں پھاڑے مجھے گھور رہا تھا۔

”اوہ کیپٹن....“ ”یک بیک اس کی“ ”ہو ہو“ چل پڑی۔

”یہی حشر تمہارا بھی ہو سکتا ہے مسٹر چانگ۔“ میں دانت پیس کر بولا۔

”کیا ہوا کیا.... اسی سے جھگڑا ہوا تھا۔ اسے تو کرئل نے اس طرح پکڑ لیا جیسے کسی چوہے کو پکڑتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ مکان کی تلاشی لے رہے ہیں۔“

اس نے میرا ہاتھ پکڑ کر دوسری طرف چلتے ہوئے کہا۔ ”میں نے اس سے بھی بُرے دن دیکھے ہیں کیپٹن۔ اس طرح میری شکل بگڑی ہے کہ میں آئینہ دیکھنا پسند نہیں کرتا تھا۔“

ہم صدر دروازے سے عمارت میں داخل ہوئے۔ بوڑھا اندرونی برآمدے کی ایک آرام

کری پر پڑا تھا اور اس کے ہاتھوں میں جھکڑیوں کا جوڑا تھا لیکن اس کی آنکھوں میں تشویش کے

آثار نہیں تھے۔ اس کی بجائے ان سے تسخر جھانک رہا تھا۔

کرئل سامنے ہی والے کمرے میں کاغذات کا ایک ڈھیر الٹ پلٹ رہے تھے۔

دفتر کرئل ہنسنے لگا۔ ہنسی بالکل مجنونوں کی سی تھی۔ پھر یک بیک اسے غصہ بھی آ گیا اور وہ دونوں ہاتھوں سے مکار دکھاتا ہوا بولا۔ ”تم لوگ ڈاکو ہو۔ اس طرح مجھے بے بس کر کے لوٹنا چاہتے ہو۔ لیکن یہاں تمہیں کچھ بھی نہیں ملے گا۔ میں کبھی کیش نہیں رکھتا۔ ایک پائی بھی نہیں۔“

”میں تمہیں تمہاری گرفتاری اور مکان کی تلاشی کا وارنٹ دکھا چکا ہوں۔“ کرئل نے سر اٹھائے بغیر کہا اور بدستور کاغذات کو الٹتے پلٹتے رہے۔

”یہ میک اپ میں ہے کیپٹن“ چانگ آہستہ سے بولا۔ ”اور خود کو پاگل ظاہر کرنے کی کوشش

کر رہا ہے۔ اس کے چہرے سے میک اپ کی نقاب ہٹ جائے تو صاف گارساں کی شکل نکل آئے گی۔“

”گارساں کی۔“

”ہاں فونگ اور گارساں ہمشکل تھے۔“

”مگر اتنے خطرناک آدمی نے اتنی آسانی سے کیسے ہتھکڑیاں پہن لیں۔“

”مجھے خود بھی حیرت ہے کیپٹن۔“ چانگ بولا۔ ”ورنہ فونگ تو اپنے سائے سے بھی بھڑکنے

والا آدمی ہے۔“

ہم دونوں آہستہ آہستہ گفتگو کر رہے تھے۔ بوڑھے نے صرف ایک ہی بار اچھٹی سی نظر ہم پر

ڈالی تھی اور پھر اپنا سر سینے پر جھکا لیا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ کہیں وہ سچ کچ کوئی مخبوط الحواس ہی نہ

ہو۔ لیکن میں نے چانگ پر اپنا خیال ظاہر نہیں کیا۔

کرئل ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں جاتے رہے۔ انہوں نے میرا حلیہ دیکھا تھا۔

لیکن نہ انہوں نے مجھے ٹوکا تھا اور نہ اس پر حیرت ہی ظاہر کی تھی۔

چانگ نے کچھ دیر بعد کہا۔ ”میرا خیال ہے کہ مجھے کرئل کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے گا۔“

”اوہ یہ فونگ ہر گز نہیں ہو سکتا۔ اگر فونگ ہو تا تو مر جاتا مگر اپنے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں نہ

پڑنے دیتا۔ لیکن یہ اس کے گردہ کا کوئی اہم آدمی ضرور ہے ویسے میرا دعویٰ ہے کہ یہ میک اپ

میں ہے.... اس کے بال.... اس کی ڈاڑھی سب نقلی ہیں۔ میں تو کہوں گا کہ کوئی اقدام کرنے

سے پہلے اسے بھی کیوں نہ آزمایا جائے۔ کہیں.... ایسا نہ ہو کہ....!“

”ٹھہرو....!“ میں نے کہا اور آگے بڑھ گیا.... دوسرے ہی لمحے میں میرا ہاتھ بوڑھے

کے سر پر پڑا۔ الجھے ہوئے بے ترتیب بال نقلی ہی ثابت ہوئے۔ اس کا سر اٹھنے کے چھلکے کی



طرح صاف تھا۔ پھر ڈاڑھی کی باری آئی اور وہ بھی نقلی ہی نکلی۔ بھلا میں مونچھیں اکھاڑنے میں کیوں دیر لگاتا۔ بوڑھا خاموشی سے بیٹھا رہا۔ جب میں اپنے کام سے فراغت حاصل کر چکا تو بوڑھا مسکرا کر بولا۔ ”اب تم پوچھو گے کہ میں میک اپ میں کیوں رہتا تھا۔۔۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مجھے اپنا گنجاسرا اچھا نہیں لگتا اور میں چاہتا ہوں کہ میرے چہرے پر خوبصورت قسم کی ڈاڑھی بھی ہو لیکن میری اصلی ڈاڑھی کسی کام کی نہیں تھی۔ دو چار بال یہاں اور دو چار بال وہاں۔“

## مزا آگیا

ہماری کار شہر کی طرف واپس جارہی تھی۔ بوڑھا میرے اور چانگ کے درمیان پھنسا ہوا تھا اور کرنل ڈرائیو کر رہے تھے۔

مجھے بوڑھے پر حیرت تھی اس نے ہمارے ساتھ آنے میں ذرہ برابر بھی ہچکچاہٹ ظاہر نہیں کی تھی۔ لیکن اس کی بڑبڑاہٹ برابر جاری ہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ ہم لوگ ضرور کوئی ٹھگ ہیں اور اس فکر میں ہیں کہ اس سے کوئی بڑی رقم اینٹھی جائے۔

”بس اب خاموش رہو۔“ میں نے اس کی بڑبڑاہٹ سے اکتا کر کہا۔ ”سو فیہ تمہیں عدالت میں شناخت کرے گی۔“

”کون سو فیہ۔“

”تمہاری بھتیجی جسے تم یورپ کی سیر کر رہے تھے۔“ میں نے کہا اور بوڑھا ہنسیاں شکل میں ہنسنے لگا۔

”اگر میری کوئی بھتیجی مجھے شناخت کر لے تو مجھے پھانسی پر لٹکا دیتا۔ مجھے کوئی اعتراض نہ ہوگا۔“ بوڑھے نے برا سامنہ بنا کر کہا۔

”تم سے زبردست غلطی ہوئی ہے حمید۔“ کرنل نے کہا۔ ”اے میک اپ ہی میں رہنے دیا ہوتا۔ میرا دعویٰ ہے کہ اب لڑکی کے فرشتے بھی اسے شناخت نہ کر سکیں گے۔“

چانگ کے منہ سے ایک تیز زدہ سی آواز نکلی اور بوڑھا ہنسنے لگا۔

”اوہو۔۔۔۔۔ میک اپ تو دوبارہ بھی کیا جاسکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہرگز نہیں۔۔۔۔۔ تم میں سے کوئی بھی اس کی ہمت نہیں کر سکتا۔“ بوڑھا غریبا۔ ”اگر ایسا ہوا

بھی تو میرے کارخانے کے لوگ مجھے اس صورت میں شناخت نہ کر سکیں گے اور یہ ہو نہیں سکتا کہ میرے کارخانے والوں سے شہادت نہ طلب کی جائے۔“

”چانگ تم نے بھی حمید کو نہ روکا۔“ کرنل کے لہجے میں مایوسی تھی۔

”میں کیا کرتا کرنل۔ یہ بہت جلد باز آدمی ہیں۔“ چانگ نے جواب دیا۔

مجھے چانگ کے ریمارک پر اتنا غصہ آیا کہ میں نے اسی کے سے انداز میں ”ہو ہو“ شروع کر دی۔

ہم گھر واپس آئے۔ نلیم نے اطلاع دی کہ لڑکی اس وقت اس طرح بے خبر سو رہی ہے جیسے اس نے ہزاروں راتیں جاگ کر گزاری ہوں۔

ہم پھر لائبریری میں آ بیٹھے۔ بوڑھا ہمارے ساتھ تھا۔ اس کے دونوں ہاتھوں میں اب بھی ہتھکڑیاں لگی ہوئی تھیں۔ لائبریری میں آنے سے پہلے کرنل نے اپنی خواب گاہ میں جا کر کسی کو فون کیا تھا۔

”اب بولو۔“ کرنل نے بوڑھے کو گھورتے ہوئے کہا۔ ”فونگ کہاں ہے۔“

”فونگ۔۔۔۔۔ بوڑھے نے اتنی حیرت ظاہر کی جیسے کرنل نے اس سے اظہار عشق کر دیا ہو۔“

”تم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ تم تے ری فونگ کے ساتھیوں میں سے نہیں ہو۔“

”میں کسی تے ری فونگ کو نہیں جانتا۔“ بوڑھے نے اس انداز میں کہا جیسے اپنے نجیب الطرفین ہونے کا یقین دلارہا ہو۔

”تم ابھی اعتراف کر لو گے۔ مجھے اس کی پرواہ نہیں ہے۔ میں ایسی اذیتیں بھی دینا جانتا ہوں جو آدمی کو سب کچھ اگل دینے پر مجبور کر دیتی ہیں۔“

”تم غیر قانونی طور پر مجھے مجبوس نہیں رکھ سکتے۔“ بوڑھا غریبا۔

اتنے میں لائبریری والے فون کی گھنٹی بجی۔ کرنل نے اٹھ کر کال ریسیو کی۔ لیکن میں نے ان کے چہرے پر سراسیمگی کے آثار دیکھے۔ چانگ بھی بہت غور سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

انہوں نے ایک جھٹکے کے ساتھ ریسیور رکھ کر دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ ”حمید میرے ساتھ آؤ۔“

میں بوکھلا گیا۔ میں نے کرنل کے چہرے پر اتنی سراسیمگی کے آثار کبھی نہیں دیکھے تھے۔ وہ

دروازے میں رک کر مڑے اور چانگ سے بولے۔ ”میری واپسی میں بیس منٹ سے زیادہ نہیں

صرف ہوں گے۔ اس کا خیال رکھنا کہ یہ نکل کر جانے نہ پائے۔ ورنہ میں پھر تمہارے لئے کچھ۔“

کر سکوں گا۔“

”اس کے فرشتے بھی یہاں سے نہ جاسکیں گے۔“ چانگ نے کہا۔ ”مگر بات کیا ہے۔“  
 ”اوہ ایک نہایت اہم معاملہ۔ لیکن یہ نجی ہے۔“ کرئل نے کہا اور آگے بڑھ گئے۔ لیکن  
 میرے پیر من من بھر کے ہو رہے تھے۔ کیونکہ میں ابھی تک کچھ ہی میں لپٹا ہوا تھا۔ نوکر مجھے  
 دیکھ کر ہنسے تھے۔ نیلم نے مضحکہ اڑایا تھا۔ لیکن مجھے غسل خانے کی بجائے لائبریری ہی کی طرف  
 جانا پڑا تھا۔ کرئل کا حکم.... اور نہ جانے اب کرئل ہی کا حکم مجھے کس پر رونق بازار میں تماشائیانے  
 جارہا تھا۔

”اوسر کار۔“ میں نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”یوں نہیں.... میرے گلے میں رسی ڈالئے اور  
 اپنے ہاتھ میں ڈگڈگی لیجئے تب مڑا آئے گا۔“  
 انہوں نے پلٹ کر میرا ہاتھ پکڑا اور کھینچنے لگے۔  
 ”چل تو رہا ہوں۔“ میں نے بے بسی سے کہا۔  
 وہ مجھے اسی طرح گھسیٹتے ہوئے عمارت کے ایک دور افتادہ کمرے میں لائے۔ یہاں کرئل کسی  
 زمانے میں مختلف قسم کے سازبجانے کی مشق کیا کرتے تھے۔  
 ”بیٹھ جاؤ۔“ انہوں نے مجھے ایک کرسی پر دھکیلتے ہوئے کہا۔ ”اب بتاؤ کہ تم بھوت کیسے بن  
 گئے تھے۔“

”پہلے آپ بتائیے کہ جانا کہاں تھا۔“  
 ”کہیں نہیں.... میں تو تمہیں یہاں اس لئے لایا ہوں کہ میں ستارہ بجاؤں گا اور تم شام  
 کلیان الاپو گے۔“

”الاپنے کو تو میں شام دلاری اور رام بیاری بھی الاپ سکتا ہوں مگر اب الو بننے کی سکت مجھ  
 میں نہیں رہ گئی۔ آخر آپ نے فون پر کس سے گفتگو کی تھی۔“  
 ”ارے وہ.... وہ تو ایک جزل مرچنٹ کی کال تھی جس نے مجھے بتایا تھا کہ سیون اوکلائک  
 کے بلیڈ بھی بازار سے غائب ہو گئے اب میں سوچ رہا ہوں کہ کون سے بلیڈ استعمال کروں۔“  
 ”بہتر ہے“ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ”اٹھائیے ستار! میں اشارت لیتا ہوں۔“  
 کرئل نے سچ سچ ستار اٹھالیا اور میں عظیم پریم راگی کی سی دردناک آواز میں الاپنے لگا۔  
 ”کیسے نہ آئی بے جیا لگن ہو بے کرینے“  
 قوالوں میں عظیم پریم راگی کے علاوہ مجھے آج تک کوئی پسند نہیں آیا۔ یہ میں نہایت سنجیدگی

سے کہہ رہا ہوں۔ وہ ایک سچا آرٹسٹ ہے۔ اور مستقبل میں صرف ”عظیم آرٹ“ ہی زندہ رہے گا۔  
 مگر معاف کیجئے گا میں اب قوالوں اور قوالیوں کا تذکرہ نہیں چھیڑوں گا۔ ورنہ پھر سسپنس کا خون  
 ہو جائے گا۔ آپ خود ہی سوچئے اس سے بڑا سسپنس اور کیا ہو گا کہ کرئل ایک مجرم کو لائبریری  
 میں چھوڑ کر اتنی بدحواسی سے بھاگے تھے جیسے فون پر کسی عزیز کی موت کی اطلاع ملی ہو....  
 لیکن.... اب وہ یہاں بیٹھے ستارہ بجا رہے تھے اور میں قوالی الاپ رہا تھا۔

آخر پھر مجھ پر جھلاہٹ کا دورہ پڑا اور میں خاموش ہو گیا۔ ستار کے تاروں پر کرئل کی انگلیاں  
 دوڑتی رہیں۔ اب انہوں نے ایک گت شروع کر دی تھی۔ میرے خدا یہ کرئل آخر کس قسم کا  
 آدمی تھا.... کتنا شاندار.... کتنا عجیب.... کتنا لا پرواہ.... اور کتنا پراسرار....

میرا غصہ ذرا ہی سی دیر میں غائب ہو گیا اور میں ستار کی لے پر اس طرح ڈوبتا چلا گیا کہ سارا  
 سسپنس ذہن کے کسی تاریک گوشے میں جاسویا۔

پھر اچانک گھنٹی کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ادھر کرئل نے بھی ستار رکھ کر ایک طویل انگڑائی  
 لی۔ سامنے والی دیوار پر لگی ہوئی گھنٹی پھر گنگنائی۔

”چوہا بھنس گیا حمید صاحب۔“ کرئل اٹھ گئے۔ ”آؤ.... اب چوہا ہمیں بھرویں سنائے گا۔“  
 ”اور میں کتے کے پلے کی طرح نیاؤں نیاؤں کروں گا۔“ مجھے پھر غصہ آ گیا۔

ہم دونوں تیزی سے لائبریری کی طرف جا رہے تھے۔ چانگ ہمیں دیکھ کر عجیب انداز میں  
 ہنساجو ”ہو ہو“ سے بہت مختلف تھا۔ وہ میز کے قریب کھڑا نظر آ رہا تھا۔

”او بھائی کرئل۔“ اس نے کہا۔ ”یہ تمہارا گھر ہے یا عجائب خانہ.... میں یہاں میز پر ہاتھ  
 رکھ کر اٹھا تھا کہ میرا ہاتھ ہی بھنس گیا۔“

اب میں نے غور سے دیکھا تو چانگ کے داہنے ہاتھ میں ہتھکڑی نظر آئی۔

”اوہ.... اچھا....!“ کرئل مسکرائے۔ ”بھئی چانگ اس میز کی دراز میں گارساں کے  
 کاغذات تھے۔ لہذا اس میں سے ہتھکڑیاں بھی نکل سکتی ہیں۔ خود ہی دیکھو تم نے تار کے ٹکڑے کی  
 مدد سے اس کا قفل کھولنے کی کوشش کی تھی حالانکہ یہ قفل اس کا عادی نہیں ہے۔ اگر اس کے  
 ساتھ ذرا بھی بد تمیزی ہو تو یہ اسی طرح یا تو ہتھکڑی اگل دیتا ہے یا خنجر۔ شکر ہے کہ تم خنجر سے  
 محفوظ رہے ورنہ وہ تمہارے سینے میں پوسٹ ہو جاتا اور میں تم سے یہ نہ پوچھ سکتا کہ پیارے مسٹر  
 تے ری فونگ تمہارے لئے کافی منگواؤں یا چائے۔“  
 ”تے ری فونگ....!“ میں میساختہ اچھل پڑا۔

بوڑھا بھی چانگ کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہا تھا۔

”کھٹاک۔“

میں چیخ پڑا۔ کرنل زمین پر بیٹھ گئے اور چاقو سامنے والے بند وازے میں پیوست ہو گیا۔ چانگ کا بایاں ہاتھ آزاد تھا۔ اس نے جیب سے چاقو نکال کر بڑی پھرتی سے کرنل کا نشانہ بنالیا تھا۔ کرنل نے قہقہہ لگایا۔ اور بڑے اچھے موڈ میں بولے۔ ”اسی جیب میں ریوالور بھی موجود ہے

چانگ اب اسے آزماؤ۔“

چانگ نے ذرہ برابر بھی سستی نہیں دکھلائی۔ ریوالور بھی نکل آیا۔ مگر چٹ چٹ کر کے رہ گیا اور پھر چانگ نے جھلاہٹ میں وہ بھی کرنل پر کھینچ مارا۔ ظاہر ہے کہ اس کا بھی وہی انجام ہوتا تھا جو چاقو کا ہوا تھا۔

”اب دیکھو نا مسٹر تے ری فونگ“ کرنل چینیوں ہی کے سے انداز میں بولے۔ تم بھی گارساں ہی کی طرح مشہور تھے۔ مگر تمہیں اس کا ہوش نہیں کہ میں نے کب تمہاری جیب سے ریوالور نکالا اور اسے خالی کر کے دوبارہ رکھ بھی دیا۔ مجھ تک آنے سے پہلے تمہیں گارساں کے انجام پر بھی نظر ڈالنی چاہئے تھی۔ کیا وہ تمہارا استاد نہیں تھا۔ لیکن جب اس کے پر نکلے تھے تو اس نے میرے ہی ملک کا رخ کیا تھا۔ خیر گارساں تو یقیناً بہت چالاک تھا مگر تم.... تم سے بڑا ذرا آج تک میری نظروں سے نہیں گذرا۔ اس پر تم نے کیسے یقین کر لیا تھا کہ میں نے تمہیں کاؤ پی چانگ ہی سمجھ لیا ہے۔ کاؤ پی چانگ جو میری تحقیقات کے مطابق اب اس دنیا میں نہیں ہے۔ تم سے کہیں زیادہ چالاک تھا۔ وہ میک اپ میں کبھی اس طرح نہ بنتا جس طرح تم بنتے ہو۔ تم نے چانگ کی ہنسی کی نقل اتارنے کی کوشش ضرور کی ہے مگر اس نکتے کو ہمیشہ بھول جاتے ہو کہ میک اپ میں ہنسنے کے اس مخصوص انداز سے اجتناب کرنا چاہئے۔ پھر دوسری بات تم نے یہ کیسے یقین کر لیا کہ چانگ کے بارے میں میرا بھی وہی نظریہ ہے جس کا عام طور پر فارموسا کی حکومت پروپیگنڈا کرتی ہے۔ کیا تم اتنی عقل نہیں رکھتے کہ اس پروپیگنڈے کا مقصد سمجھ سکو۔ کاؤ پی چانگ چین کا بہترین دماغ تھا۔ اس سے سرخ چین کی حکومت کو خدشہ ہو سکتا ہے لہذا فارموسا کی حکومت سرخ چین کو اس خلس میں مبتلا رکھنا چاہتی ہے کہ چانگ زندہ ہے اور وہ ایک نہ ایک دن اس کا تختہ ضرور الٹ دے گا۔ بس اتنی سی کہانی ہے اس پروپیگنڈے کی جو فارموسا سے سرکاری طور پر کیا جا رہا ہے۔ آئے دن وہاں کارڈیو اسٹیشن چیتا رہتا ہے کہ چانگ زندہ ہے اور عنقریب وہ قوم پرستوں کا ہیرو

بن جائے گا۔ بس اسی لئے تم اپنی نقلی پیٹ کی کہانی لے کر میرے پاس دوڑے آئے۔ آنتیں نکال کر دکھائیں تاکہ میں یقین کر لوں کہ تم کس طرح اپنے دشمنوں کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گئے تھے اور حقیقتاً زندہ ہو.... اور تمہاری اس اچھل کود کا مقصد یہ تھا کہ کسی طرح گارساں کے کاغذات تمہارے ہاتھ لگ جائیں۔ ریکارڈ روم میں گھسنے کی ہمت تم میں نہیں تھی لہذا تم نے اپنی ذہانت پر اعتماد کر کے مجھے الو بنانے کی اسکیم بنا ڈالی۔ اپنے ماتحتوں کے ذریعے ایک ڈراما اسٹیج کر لیا اور مجھے یقین دلاتے رہے کہ وہ تے ری فونگ کے آدمی ہیں۔ تے ری فونگ کو بے حد پراسرار آدمی بنا کر پیش کیا اور پھر یہ تجویز میرے سامنے رکھی کہ وہ کاغذات نکالے جائیں جو گارساں کی گرفتاری کے بعد اس کے پاس سے برآمد ہوئے تھے۔ تم نے خیال ظاہر کیا تھا ممکن ہے انہیں کاغذات سے کوئی ایسی بات معلوم ہو سکے جس سے تے ری فونگ کے متعلق کچھ معلوم ہو جائے۔ میں جو تمہیں ایک چوہے کی طرح پکڑنے کا تہیہ کر چکا تھا اس پر آمادہ ہو گیا اور پھر مجھے یہاں لا بریری میں یہ میز رکھوانی پڑی۔ ورنہ تمہارے ہی قول کے مطابق یہ میرے عجائب خانے ہی میں پڑی رہتی ہے۔“

”بس ختم کرو یہ مذاق“ چانگ نے ہونٹوں پر زبان پھیر کر مسکرائے کی کوشش کی۔

”مگر تمہارے مذاق نے تو مجھے ہی ختم کر دیا ہوتا۔ یہ چاقو.... وہ ریوالور.... یہ ریوالور تو دراصل اس بوڑھے کے لئے تھا اگر تمہیں موقع مل جاتا تو میرا اعتماد حاصل کرنے کے لئے تم اسے ختم ہی کر دیتے۔ مجھے یقین ہے کہ اس بوڑھے یا تمہارے دوسرے ساتھیوں نے آج تک تمہاری شکل نہ دیکھی ہوگی۔ تم نے سوچا تھا کہ اگر یہ سب گرفتار ہو گئے تب بھی تمہارا کچھ نہ بگڑے گا۔ یہ تمہاری نشاندہی نہیں کر سکیں گے۔ مگر اس لڑکی کی کہانی مجھے ضرور سناؤ۔ تم نے حقیقتاً ان کاغذات کے لئے بہت بکھیرا کیا تھا۔ ایک ایسی لڑکی کی کہانی یقیناً میرا ذہن الجھا سکتی تھی اور میں تمہارے شبے کی بناء پر گارساں کے کاغذات ریکارڈ روم سے نکال سکتا تھا۔ مگر تمہاری ہنسی.... سچ پوچھو تو.... تم ہنسی کی وجہ سے مارے گئے۔ ورنہ ہو سکتا تھا کہ تم مجھے فریب دینے میں کامیاب ہی ہو جاتے۔ کیونکہ تمہارا میک اپ بڑا شاندار تھا اور اس معاملے میں تم یقیناً گارساں سے ٹکر لیتے ہو.... آہاں ان کاغذات کو تو میں بھول ہی گیا۔ حمید اذرا ان کی پشت کھولو۔ بس کوٹ اور قمیض اوپر اٹھا دو۔“

”خبردار.... اگر کوئی میرے قریب آیا۔“ فونگ دھاڑا اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں۔ اس نے پھر گرج کر کہا۔ ”ابھی میرا ایک ہاتھ اور دونوں پیر آزاد ہیں اور میں تے ری فونگ ہوں.... فونگ دی گریٹ۔“ پھر اس نے اپنی زبان میں کچھ کہا۔ یقیناً یہ ”منم“ قسم کا کوئی نعرہ ہی تھا۔ ”میں تمہارے قریب آؤں گا۔“ کرنل مسکرائے۔ ”اور اسی بات پر تمہیں آزاد بھی کر دوں گا تاکہ تمہیں اپنے کمالات دکھانے کا موقع مل سکے۔“

کرنل آگے بڑھے اور فونگ نے میز پر بایاں ہاتھ ٹیک دولتی چلائی۔ لیکن میں نہیں دیکھ سکا کہ کرنل نے کیا کیا۔ ویسے یہ تو دیکھ ہی رہا تھا کہ دوسرے ہی لمحے میں میز دوسری طرف گر گئی اور خود فونگ اسی پڑھیر ہو گیا۔ کرنل نے اسے دبوچ کر میز کی دراز کا ہینڈل گھمایا اور اس کا داہنا ہاتھ ہتھکڑی کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔

”اب آؤ“ کرنل اسے چھوڑ کر بیٹھے ہوئے بولے۔ مگر فونگ اٹھ نہ سکا۔ گرتے وقت پہ نہیں کہاں چوٹ آئی تھی جس نے اسے نڈھال کر دیا تھا اور وہ شاید اسی کی بناء پر آنکھیں کھولنے میں بھی دشواری محسوس کر رہا تھا اور اس کا سارا جسم کسی چوٹ کھائے ہوئے مینڈک کی طرح کانپنے لگا تھا۔

کرنل نے اس کی پشت سے لباس ہٹایا اور آہستہ سے بولے۔ ”یہ بلاشبہ فونگ ہے۔ یہ نشان دیکھو۔“

فونگ بیہوش ہو چکا تھا۔ میں نے اس کی پشت پر سرخ رنگ کا ایک نشان دیکھا جو چھپکلی سے مشابہ تھا اور یہ نشان پیدا کئی معلوم ہو تا تھا۔

”ان کاغذات کو یہ اسی لئے حاصل کرنا چاہتا تھا کہ ان میں اس چھپکلی کے نشان کا تذکرہ ملتا ہے۔ گارساں کے ساتھیوں میں اس کے کچھ ایسے معتمد بھی تھے جنہوں نے گارساں اور فونگ دونوں ہی کو دیکھا تھا۔ لیکن دونوں کی شکلیں یکساں ہونے کی بناء پر انہیں بھی دھوکہ ہو جاتا تھا۔ اس لئے یہ چھپکلی ان دونوں کے درمیان امتیازی نشان قرار پائی تھی۔ مگر یہ کاغذات اس بات کی وضاحت نہیں کرتے کہ چھپکلی کا نشان رکھنے والا فونگ کہلاتا ہے۔ بس اس کا تذکرہ چھپکلی والا لکھ کر کیا گیا ہے۔ یا پھر بعض جگہ یہ لکھا گیا ہے کہ وہ جس کی پشت پر چھپکلی کا نشان ہے۔ تمہیں یہ بھی یاد ہو گا کہ گارساں کا کس ختم ہونے کے بعد اخبارات میں ان کاغذات کے خوب خوب تذکرے

ہوئے تھے اور لکھا گیا تھا کہ گارساں کے جتنے بھی ساتھی گرفتار ہوئے ہیں ان میں کوئی ایسا آدمی نہیں مل سکا جس کی پشت پر چھپکلی کا نشان ہو تا۔ بہر حال اس کے سر پر چھپکلی ہی سوار تھی کہ یہ اس کے لئے یہاں دوڑا آیا۔“

”تو یہ دوہرا میک اپ کرتا تھا۔“ میں نے پوچھا۔

ہاں قطعی دوہرا.... اصلی چہرے پر چانگ کا پلاسٹک میک اپ ہے اور اس میک اپ پر یہ دوسرے معمولی قسم کے میک اپ کرتا رہتا تھا۔

چلے کہانی بھی ختم ہو گئی۔ جناب اب بقیہ نتائج آپ خود اخذ کر لیجئے۔ ذرا سوچئے تو کہ فونگ مجھے کس طرح گھسٹا رہا تھا اور خود کس طرح گھسا گیا تھا۔ گویا کرنل نے اس دن تہیہ کر لیا تھا کہ فونگ کو پکڑ ہی لیں گے ورنہ اس مہم پر روانگی سے پہلے اسی کے سامنے وہ کاغذات اس میز کی دراز میں کیوں رکھتے جس میں آٹو میک ہتھکڑی موجود تھی۔ گویا انہیں پہلے ہی سے علم تھا کہ اس جدوجہد کا نقشہ کیا ہو گا۔ یعنی انہیں معلوم تھا کہ وہ بوڑھے کو پکڑ کر لے ہی آئیں گے اور پھر فونگ کو موقع دیں گے کہ وہ کاغذات چرانے کی کوشش کرے۔

آٹو میک ہتھکڑی کا سلسلہ اس گھٹی سے ملایا گیا تھا جو اس کمرے میں لگی ہوئی تھی جہاں ہم دونوں نے گایا بجایا تھا۔

کیا اب یہ بھی بتانے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے کہ بانسوں کے لدے ہوئے اس ٹرک پر کرنل ہی کے آدمی تھے۔ جس نے جہریالی تک میرا اور سوفیا کا تعاقب کیا تھا۔ وہ لوگ یہ دیکھنے کے لئے پیچھے گئے تھے کہ ہمارا تعاقب کیا جاتا ہے یا نہیں۔ یہاں بھی فونگ سے غلطی ہوئی تھی۔ فونگ کو ہمارا تعاقب ضرور کرنا چاہئے تھا.... کرنل اسی سے اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ سوفیا کا اغواء عین فونگ کی مرضی کے مطابق ہوا تھا.... اور وہ خاص طور سے ہمارے سر منڈھی گئی تھی۔

اب میں آپ کو ہرگز نہیں بتاؤں گا کہ فونگ کا کیا حشر ہوا.... اور وہ کس ملک کے لئے کام کر رہا تھا۔ کیوں کہ یہ ملک کے راز ہیں۔

رہا سوفیا کا معاملہ تو اسے اس کے وطن بھجوا دیا گیا اور اسے اصل معاملے کا علم ہی نہ ہو سکا۔

بوڑھے نے اقبال جرم کر لیا تھا۔ سوفیا کو اسی نے ورغلا یا تھا ورنہ وہ حقیقتاً معصوم تھی۔

فونگ کے ساتھی تعداد میں دس گیارہ تھے۔ لیکن انہیں فونگ کی شخصیت کا علم نہیں تھا۔



ان لوگوں کو ان کے ملک کی حکومت کی طرف سے ہدایت ملی تھی کہ وہ فونگ نامی ایک شخص کے احکامات کی تعمیل کریں جو ان کے سامنے نہیں آئے گا۔ بلکہ پس پردہ ان پر کنٹرول کرے گا۔  
 ”اچھا جناب اب اجازت دیجئے۔ لیکن خدارا میری یہ کہانی زیادہ پسند نہ کیجئے گا ورنہ مجھے بھی شاعروں ہی کی طرح ”واہ واہ“ کی چاٹ پڑ جائے گی اور میں اپنے دھندے سے بھی جاؤں گا۔“  
 ”اس کہانی سے دو نصیحتیں حاصل ہوتی ہیں اول تو یہ کہ آنکھیں بند کر کے کسی کے پیچھے مت چلو۔ ورنہ کوئی فونگ تمہیں اُلو بنا کر رکھ دے گا۔۔۔ دوسری نصیحت یہ کہ خوبصورت لڑکیوں کے چکر میں ضرور پڑو کیونکہ دھکے کھائے بغیر آدمی دنیا کے سرد گرم سے آشنا نہیں ہو سکتا۔“

تمام شد